Registered No. L. 5340

جلد ۳۲
عدد ۱-۲

شائع شدہ ماہِ اگست

رجب
شعبان ۱۳۶۸ھ

ماھنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ :

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

معذرت

یہ دو ماهی رساله بہت عجلت میں مرتب کیا گیا ھے - اس وجه سے شاید مضامین کا تنوع معیاری نه هو ، علاوه بریں اس میں «مطالبه نظام اسلامی» اور «آزادی کے اسلامی تقاضے» ، دوایسی تقریریں شامل هیں جو کتابی صورت میں شائع هوچکی هیں - ان کا معامله یوں ھے که پہلے ایک مرتبه ترجمان کے بجائے ماهانه سلسلۂ کتابیات شائع کرنے کا فیصله کیا گیا تھا لیکن جب ان تقاریر کے فرمے چھپوائے جاچکے تو معلوم هوا که ماهانه کتابی سلسله کی اشاعت پر محکمه پریس برانچ کو اعتراض هوگا - چنانچه کام روک دیا گیا - اب ترجمان القرآن کے ازسر نو جاری هونے پر مشورے کے بعد مناسب یہی سمجھا گیا که ان مطبوعه فرموں کو تازه پرچے میں شامل کردیاجائے ، تاکه دفتر ایک بھاری مالی نقصان سے بچ جائے اور یوں بھی ان تقاریر کی قدر و قیمت اتنی ھے که ان کی اشاعت عام مفید مقصد ھے -

اب انشاء اللہ پے در پے دو تین پرچے نکال کر هم ترجمان القرآن کی اشاعت کو بہت جلد بالکل ماه به ماه کرلیں گے - اور مضامین کی تیاری و ترتیب بھی معیار پر آجائیگی -

(نیاز مند « مرتب »)

خریداری نمبر بدل دئیے گئے هیں !

چونکه تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل کر دئیے گئے هیں - اس لئے خریداران « ترجمان القرآن » سے گذارش ھے - که اپنے جدید نمبر خریداری کو (جو چٹ پر درج ھے) نوٹ فرمالیں اور آئنده خط و کتابت میں نمبر کا حواله ضرور دیا کریں - نیز جو اصحاب منی آرڈر کے ذریعه سے اپنا چنده ارسال فرمائیں - وه کوپن پر اپنا پورا پته معه نمبر خریداری درج کرنے کا التزام فرمائیں - جو حضرات نمبر خریداری کا حواله نه دیں گے انکی شکایات دور کرنے میں دفتر معذور هو گا -

نیاز مند « مینیجر »

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۲	رجب ۱۳۶۸ھ	مطابق	جون ۱۹۴۹ء	عدد ۱

اشارات:	نعیم صدیقی	۲
مقالات:		
مطالعۂ نظام اسلامی	سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی	۱۳
آزادی کے اسلامی تقاضے	مولانا امین احسن صاحب اصلاحی	۳۳
رسائل و مسائل:		
زکوٰۃ کے چند مسائل	مولانا عبدالغفار حسن صاحب	۶۵
مطبوعات		۶۹

جلد ۳۲	شعبان ۱۳۶۸ھ	مطابق	جولائی ۱۹۴۹ء	عدد ۲

اشارات:	نعیم صدیقی	۷۲
مقالات:		
معاشی ناہمواریوں کا اسلامی علاج	نعیم صدیقی	۸۹
رسائل و مسائل	نعیم صدیقی	۱۳۰
مطبوعات	″	۱۴۴

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور (۱) میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آشیا کی قیادت کرنے والی ٹیم جن افراد پر مشتمل ہے، اُن کے پاس اور کچھ نہیں تو کم سے کم کچھ "خدمات" اور کچھ "قربانیاں" ضرور ہیں (اگرچہ ان خدمات اور قربانیوں کے باوجود موجودہ وزارت اور قیادت کے خلاف نفرت کا کھلا کھلا اظہار ہونے لگا ہے، اور کلکتہ کے حالیہ واقعات تو نہرو گورنمنٹ کے خلاف عدم اعتماد کا نہایت تلخ مظاہرہ ہیں) لیکن پاکستان کی سربراہ کاری کے لئے جو ٹیم تقدیرِ الٰہی کی طرف سے نامزد ہوئی ہے، اس کے افراد پر زمانہ اتنا مہربان رہا ہے کہ وہ ایک پیسے کی قربانی دیئے بغیر، ایک دن جیل میں گذارے بغیر، اپنی عادات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کیئے بغیر سیدھے صوفوں سے اُٹھ کر قالینوں پر قدم رکھتے ہوئے اقتدار کی مسندوں پر براجمان ہو گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محض اپنی جاگیرداریوں، اپنی ملازمتوں، اپنے کاروباروں اور اپنی وکالتوں کے زور سے لیڈر بنے ہیں، اور ان کو علم، اخلاق اور سیاسی خدمات میں امتیازی مقام حاصل کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔

اب ایسے لوگوں کو اگر ایک قوم کے سپید و سیاہ کا مالک بنا دیا جائے تو وہ اس کے سوا آخر اور کریں گے کیا کہ انہیں اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لئے جو مواقع مل سکیں اُن سے فائدہ اٹھائیں۔ قانون اور اختیار سے جو خدمت لی جا سکے وہ لیں۔ عیش و راحت کے زیادہ سے زیادہ ذرائع پر قبضہ کریں، ٹھاٹھ باٹھ اور استکبار کے مظاہرے کے لئے قوم اور ریاست کے خزانے پر زیادہ سے زیادہ بار ڈالیں، ——— اس کے سوا آخر اور کسی چیز کی توقع ان حضرات سے کس بنا پر کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ پاکستان کے صوبوں کی وزارتِ عظمیٰ جیسے محترم مناصب کے لئے جن افراد کو بہترین قرار دے کے آگے لگایا گیا تھا، انہوں نے خیانت کی سخت گھناؤنی صورتیں اختیار کیں، انہوں نے عہدوں کے تحفظ کے لئے، اپنے ایم ایل اے ساتھیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ذلیل ترین چالیں چلیں، انہوں نے کاربرآری کے لئے مکروہ ترین سازشیں کیں اور انہوں نے قوم کے امانتی اموال کو اپنے ساتھیوں کا اعتماد خریدنے کے لئے بطور رشوت استعمال کیا۔ اور انہوں نے قومی فنڈز کو علانیہ خورد برد کیا۔ پھر ان کے ساتھ کام کرنے والے وزرا اور پارلیمنٹری

سیکرٹریوں نے ایوانِ حکومت میں باقاعدہ اکھاڑے قائم کئے، اور ہمارے ایم۔ ایل۔ اے حضرات جو سیاسی حیثیت سے قوم کا کھن قرار پائے تھے، ٹولیاں ٹولیاں ہو کر آپس میں دست و گریباں ہوتے رہے اور ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیوں اور غیبتوں کا طوفان بپا کرنے میں مصروف رہے۔ پھر ان حضراتِ اکابر نے اخبار نویسوں کے ضمیر خریدے اور ان کے دماغ اور قلم کرائے پر حاصل کیے، انہوں نے رائے عامہ کو اپنے ساتھ لینے کے لئے بے شمار دلال میدان میں چھوڑ رکھے۔ پھر غضب یہ کہ ان قائدینِ کرام نے انگریز کے ترکے میں حاصل کئے ہوئے پبلک سیفٹی ایکٹ کو اختلاف کرنے والوں، تعمیری تنقید کرنے والوں اور اصلاح کا علم بلند کرنے والوں کے خلاف ایسے اندھا دھند طریق سے استعمال کیا کہ بس

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"

کا سماں پیدا ہو گیا۔

یہ ساری شطرنج سیاست اس حال میں کھیلی گئی جب کہ کشمیر کے مسلمان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اور محاذِ کشمیر پر مجاہد نوجوان اپنا خون بہا رہے تھے۔ یہی لوگ ایک طرف جہادِ کشمیر کے داعی تھے اور جہادِ کشمیر کا واسطہ دلا دلا کر قوم سے قربانیوں کی اپیل کر رہے تھے لیکن دوسری طرف یہی وہ لوگ تھے جو سب سے زیادہ بے باکی کے ساتھ جہادِ کشمیر کی سرگرمیوں کو نقصان پہنچا رہے تھے ------ اور آج اگر مسئلہ کشمیر کھٹائی میں پڑا ہوا ہے تو اس کی ذمہ داری بہر حال انہی کے زرّیں کارناموں پر عائد ہوتی ہے۔

مغربی پنجاب جو پاکستان کا اہم ترین صوبہ ہے اور جس کی صلاح و فساد پہ پورے پاکستان کے صلاح و فساد کا دار و مدار ہے قیادت نے جب اُسے طرح طرح کے ناقابلِ علاج روگ لگا دیئے اور عوام کا سخط حد سے بڑھ گیا تو مرکز کو ہوش آئی اور گورنر جنرل نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر اس صوبہ کی وزارت اور پوری اسمبلی کو نااہلیت اور فرض ناشناسی کی سند دے کر برطرف کر دیا۔

ادھر صوبۂ سرحد میں قیوم وزارت کا چنگیزی راج رائے عامہ کو اس بُری طرح پامال کر رہا ہے اور جمہوریت کو اپنی کند چھری سے اس بے باکی سے ذبح کر رہا ہے کہ کوئی احتجاج اس کے لئے قابلِ توجہ نہیں ہے، پریس اور اسٹیج سے جو لعنتیں اس پر برس رہی ہیں، اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ حد یہ کہ عدالتوں اور قانون تک کو وزارتی

گردنے اپنے دباؤ کے نیچے لے رکھا ہے۔ پورے صوبہ سرحد میں شہری آزادیوں کا قطعی خاتمہ ہو چکا ہے۔ جھوٹے الزامات لگا کر اختلاف کرنے والوں کو گرفتار کیا جاتا ہے، بناوٹی مقدمات چلائے جاتے ہیں اور پھر قانون کے تقاضوں کے خلاف گرفتار شدگان سے نہایت کمینہ سلوک کیا جاتا ہے۔ پھر اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ کھلے واقعات کے خلاف وزراء برسرِ عام ٹوپی بدل دلیری سے جھوٹ بول دیتے ہیں۔ مرکز اس صورتِ حالات کو خاموش تماشائی بن کر دیکھ رہا ہے، بلکہ درحقیقت کسی کو بھی حمایت قیوم وزارت کی پشت پر ہے جو ظاہر ہے کہ بغیر اس کے کہ قیوم وزارت کی یہ مجال نہیں کہ وہ اندھیر مچا دے۔ ہم جو دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ جہاں کی قیادت کا ایک ستون اپنے ظلم و بداخلاقی کی دیمک کا لقمہ ہو کر گر پڑا تو جو دوسرا اس کی جگہ کھڑا کیا گیا، وہ اور بھی بودا ثابت ہوا اور پھر اس ادل بدل میں جو سازشی حرکات بڑوں نے سرانجام دی ہیں، وہ ہماری قیادت کی شرمناک تصویر سامنے لانے کے لئے کافی ہیں۔

یہ نہ سمجھئے کہ اس افراتفری کی ذمہ داری چند مخصوص افراد پر عاید ہوتی ہے جن کے ذلیل کارنامے بالکل کھل کر سامنے آ چکے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ساری بھیڑیں کالی ہیں اور قیادت کی لنکا میں جو ہے وہ باون گزہی کا ہے۔ یہ کچھ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی شرافت کی زریں قبائیں ابھی پوری طرح تار تار ہونے نہیں پائیں، ورنہ یہاں جو بڑے سے بڑے "تقدس مآب" پائے جاتے ہیں، اُن کو بھی آج گھسیٹ کے کسی بے لاگ عدل پرور عدالت میں لا کھڑا کیا جائے تو یہ چھپے رستم کھلے رستموں کے کان کترنے والے ثابت ہوں گے ——— اور پھر اگر کوئی اکا دکا فرد براہِ راست گندے جرائم میں حصہ دار بھی نکلے تو اس کی شخصی پاک دامنی کو قیادت کی پوری ٹیم پر نہیں پھیلایا جا سکتا اور نہ اس کے طفیل ساری منڈلی کو معاف کیا جا سکتا ہے۔

غور فرمائیے! یہ وہ لوگ ہیں جو غیر مسلم اقوامِ عالم کے سامنے اپنے مسلم ہونے پر فخر کرتے ہیں، یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہمارا خدا ہے، ہم ایک بہترین نمونۂ انسانیت کو اپنا نبی ماننے والے ہیں، ہمارے پاس قرآن نام کا آسمانی ضابطۂ حیات ہے، ہماری پشت پر ایک بے مثال تاریخ عظمت اپنے شاندار روایات کے خزانے لئے موجود ہے، ہم خلافتِ راشدہ پر نگاہیں مرتکز کرنے والے لوگ ہیں، ہم دین کو سیاست سے الگ نہیں مانتے ——— اور پھر یہ اُس اُمت کے افراد ہیں جو ساری دنیا کی امامت کے منصب پر بٹھائی گئی تھی، جسے اصلاحِ انسانیت اور تعلیم و تربیتِ اقوام کا فریضہ سونپا گیا تھا!

پھر یہی وہ لوگ ہیں جو کل تک ہندوؤں اور سکھوں کے سامنے یہ دعوے لے کے کھڑے ہوئے تھے کہ ہمارا دین

الگ ہے، ہماری زندگی کے بنیادی اصول جدا ہیں، ہماری تہذیب تم سے مختلف ہے، ہم اپنا سیاسی و معاشی نظام جداگانہ قسم کا رکھتے ہیں، لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ اپنے لئے ایک جداگانہ خطۂ ارضی کا مطالبہ کریں اور اپنی اسلامی حکومت الگ قائم کریں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کیا آپ کا دین، آپ کے اصول، آپ کی تہذیب اور آپ کی اسلامی حکومت یہی تھی جس کا مظاہرہ آپ دنیا کی کافر اقوام کے لیڈروں سے بھی پست تر ہو کر کر رہے ہیں؟

پھر یہ عین وہی لوگ ہیں جو اپنی پوری سیاسی تحریک میں اپنی غلط سے غلط سرگرمیوں میں اسلام کو ساتھ ساتھ گھسیٹتے پھرے ہیں، انہوں نے قرآن کی آیتوں اور حدیث کی روایتوں کو اپنی قوم پرستانہ کشمکش کے ہر مرحلے میں استعمال کیا ہے، انہوں نے پاکستان کے معنی ہمیشہ لا الٰہ الا اللہ بیان کئے ہیں ۔۔۔ لیکن افسوس کہ ان کی محبت اسلام کے، ان کی خدا پرستی کے، ان کی حب رسالت کے، ان کی قرآن دوستی کے اور ان کی لا الٰہ خوانی کے جو عملی مناظر پاکستان کی تیس ماہ کی تاریخ کے عجائب خانے میں آراستہ ملتے ہیں، ان کو دیکھ کر ہر حساس مسلمان کی گردن شرم سے جھکی جاتی ہے۔

کسی ملک و قوم کی انتہائی بدقسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے۔ ایک سفینۂ حیات کو غرق کرنے کے لئے طوفان کی موجیں وہ کام نہیں کر سکتیں جو اس کے خیانت کار ملاح کر سکتے ہیں۔ کسی قلعہ کی دیواروں کو دشمن کے گولے اس آسانی سے نہیں چھید سکتے جس آسانی سے اس کے فرض ناشناس سنتری اس کی تباہی کا سامان کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک ملت کے لئے بیرونی خطرے اتنے مہلک نہیں ہوتے، جتنا کہ نااہل قیادت کا داخلی خطرہ مہلک ہوتا ہے۔ پھر اگر حالات معمولی نہ ہوں بلکہ ایک قوم کی تعمیر کا آغاز ہو رہا ہو اور یہ آغاز بھی نہایت ناسازگار احوال کے درمیان ہو رہا ہو۔ ایسے حالات میں کسی غیر صالح قیادت کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا کرنا خلاف مصلحت ہے۔ ایک غلط قیادت کی بقا کے لئے کسی طرح کی کوشش کرنا ملک و قوم کے ساتھ سب سے بڑی غداری اور غلط قیادت سے نجات دلانے کی فکر کرنا اس کی سب سے بڑی خیر خواہی ہے۔

لیکن اگر اس خیر خواہی کے راستے ہی بند کر دیئے جائیں، اور اصلاحی اور تعمیری قوتوں کے لئے کام کرنے

کا ہر دروازہ مقفل ہو جائے تو یہ ایک سخت خطرناک فالِ بد ہے —— اور قاعدے کی بات ہے کہ جب کسی حکومت، کسی اقتدار، یا کسی قیادت کے لئے کوئی عقلی و اخلاقی وجہِ جواز باقی نہیں رہتی تو وہ اصلاح و تغیر کے راستوں کو لازماً بند کر دیتی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں بھی اصلاح و تغیر کی ہر سعی کو کچلنے کے لئے پورے انتظامات کر دئے گئے ہیں۔

ان انتظامات میں سے ایک یہ ہے کہ عوامِ ملک کو زندگی کی روزمرہ کی مشکلات میں بُری طرح الجھا دیا گیا ہے، نیز بہت ہی حکیمانہ طریق سے اُن میں بددلی، مایوسی، جمود اور ذہنی انتشار کو پھیلا دیا گیا ہے تاکہ عامۂ الناس اپنے اکابر کا احتساب کرنے اور ان کی غلطیوں پر حرف گیری کرنے اور ان سے ان کی بے راہ روی پر باز پرس کرنے کے قابل نہ رہیں۔ دوسری تدبیر یہ کی گئی ہے کہ دربارِ قیادت نے ایسے سیاسی مفتیوں کی خدمات حاصل کر لی ہیں جو کلمۂ حق کہنے والوں کو غدار اور ففتھ کالمسٹ قرار دینے کے لئے فتوے نشر کرتے رہتے ہیں۔ تیسری طرف خطرہ خطرہ کا اعلان کر کے اور قوم میں انتشار پھیلنے کے اندیشے کو ظاہر کر کے اصلاح کی ہر تحریک کو دبانے کا پروگرام اختیار کیا گیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ ایک خاص سیاسی پارٹی —— مسلم لیگ —— کو حکومت نے اپنا متبنّیٰ بنا کر ایک طرح کی یک جماعتی آمریت کو ملک پر غالب کر کے دوسری جماعتوں کو پیچھے ہٹا دیا ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ سیفٹی ایکٹ کے ذریعے آزادیٔ رائے اور حقِ تنقید کا پورے ملک میں خون کیا جا رہا ہے۔ پھر ریڈیو جیسے نشرِ افکار کے وسیع الاثر وسیلے کو اجارہ دارانِ اقتدار نے اپنے پروپیگنڈے کے لئے مخصوص کر رکھا ہے اور ان سے اختلاف کرنے والوں کے لئے اظہارِ خیالات کے دروازے بند ہیں لیکن قیادت کے حفاظتی انتظامات اتنے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے مریدانِ خاص اور اس کے وکلا کا ایک لشکر کا لشکر ہر شہر اور بستی میں پھیلا ہوا ہے، جو اپنی اغراض کے لئے قیادت کے "خدائی حقوق" (

) کو بحال رکھنے کے لئے اس کی "کرامات" کا چرچا کرتا رہتا ہے

اور اس سے اختلاف کرنے والوں پر ہر طریق سے حملہ آور ہونے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔

ان حالات میں اصلاح کی آواز بلند کرنا ٹھیک اُس "افضل الجہاد" کی حیثیت رکھتا ہے جس کی سعادت نبی صلعم کے قولِ مبارک کے مطابق صرف ان لوگوں کے لئے خاص ہے جو سلطانِ جائر کے سامنے نتائج

سے بے پروا ہو کر کلمۂ حق کہہ سکتے ہوں۔ جماعت اسلامی نے اس افضل الجہاد میں سبقت کر کے خیر خواہیٔ ملت کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی وہ اپنے اس شرعی فریضہ کی ادائی سے غافل نہیں ہو سکتی۔

جماعت اسلامی نے باطل کے مخالفانہ اقدامات کی پروا کئے بغیر ایک ہمہ گیر تعمیری تبدیلی کو عملاً برپا کرنے کے لیے سنہ ۱۹۴۸ء کے آغاز سے مطالبہ "نظام اسلامی" کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ مہم ایک منظم عوامی تحریک بن گئی اور ایک سال کی پیہم جدوجہد کے بعد دستور ساز اسمبلی کو اس نے مجبور کر دیا کہ وہ اس مطالبہ کو دستوری حیثیت سے تسلیم کر لے۔ اس ایک سال کے دوران میں دین کے بے شمار خدمت گزاروں نے اپنا وقت اور مال راہِ حق میں صرف کیا، متعدد اخبارات و جرائد سیفٹی ایکٹ کے وار سے "شہید" ہو گئے اور جماعت کے امیر کو دو رفقا سمیت مغربی پنجاب میں اور تقریباً ۱۱ ارکانِ جماعت کو صوبہ سرحد میں حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ لیکن تشدد کے یہ سارے وار جماعت کی سرگرمیوں کو کمزور کرنے میں ناکام رہے، بلکہ "ذوقِ جرم" "ہر سزا" کے بعد تیز تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۲۔ مارچ کو پاک دستوریہ نے قراردادِ مقاصد میں خدا کی حاکمیت، نیابتِ الٰہی، اور "حدود اللہ" کی پابندی کے اصولوں کو قبول کر لیا۔

* "مطالبہ" جس دن میدان میں آیا تھا، اسی دن ایوانِ اقتدار میں "یہ خطرہ" سونگھ لیا گیا تھا کہ اس مطالبہ میں تبدیلیٔ قیادت کا مطالبہ فطرۃً مضمر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی نظام اپنے قیام و نفاذ کے لئے اسلامی ذہنیت اور اسلامی سیرت رکھنے والے کارکنوں کا محتاج ہے۔ اس وجہ سے نظامِ اسلامی کے قیام کی تحریک از خود انقلابِ قیادت کی تحریک بھی تھی۔ چنانچہ اس خطرہ کو ترجمان القرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا گیا اور قیادت کے گزشتہ کارناموں پر ایک کھلا کھلا تبصرہ کرنے کے بعد یہ قطعی سوال عوام پاکستان کے سامنے رکھ دیا گیا کہ:-

> جو کچھ ہو چکا ہے، وہ تو امٹ ہے۔ اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اب اس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اُس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں، کیا اُن کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو

اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح (یعنی جس کی تفصیل کی جا چکی ہے) حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے سے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں، جن کا بیشتر حصہ خود اس قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے انہیں حل کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں؟"

یہ سوال ایسے حالات میں پوری مومنانہ جسارت کے ساتھ برسرِ عام رکھ دیا گیا تھا، جب کہ بڑے سے بڑے حریت نواز ــــ چاہے خلوتوں میں قیادت کو کتنا ہی سخت سست کہہ کر اپنی بھڑاس نکال لیتے ہوں ــــ برسرِ عام تعریف و ثناخوانی اور تملق کے سوا اور کچھ کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اقتدار پرست عناصر میں اس سوال پر سخت اضطراب پیدا ہوا۔ یہ آوازِ حق جس شخص نے بلند کی تھی وہ اپنے اس ناقابلِ معافی جرم کی وجہ سے ــــــــ اور درحقیقت اس کا اصل جرم یہی تھا ــــ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا لیکن زیادہ دیر نہ گذرنے پائی تھی کہ اس کی آواز ہر گلی کوچے میں دہرائی گئی، جہاں تک کہ گورنر جنرل پاکستان تک کو بھی اس کی تصدیق کرنی پڑی۔

ترجمان القرآن کا مجوزہ سوال آج پہلے سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ ملک کے سامنے کھڑا جواب طلب کر رہا ہے!

اس دوران میں قیادتِ پاکستان نے قراردادِ مقاصد پاس کر کے اس کے الفاظ کو اپنی اجارہ دارانہ اقتدار کے تحفظ کا ایک آخری ذریعہ بنایا ہے لیکن فی الحقیقت یہ قراردادِ مقاصد اس کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے۔ اس قرارداد کا ہر لفظ اپنے ساتھ ذمہ داریوں کا ایک بارِ گراں لئے ہوئے ہے اور یہ ذمہ داریاں قراردادِ مقاصد کے مصنفین سے پکار پکار کے کہہ رہی ہیں کہ ہمارے تقاضے پورے کرو لیکن بدقسمتی سے ان تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت یہاں سرے سے ناپید ہے۔ ان حالات میں قراردادِ مقاصد کے مقدس الفاظ، ان کے تقاضوں اور اس کے مصنفین کی ذہنیتوں اور سیرتوں کا تضاد روز بروز فاش سے فاش تر ہو رہا ہے۔ یہ قراردادِ خدائی حکومت کو چلانے کے لئے ایسے کارکن طلب کرتی ہے جو اپنی زندگیاں پوری طرح

اس کی اطاعت و نیابت میں دے دیں، یہ قرارداد تقاضا کرتی ہے کہ نظامِ حکومت کو چلانے والے حدود اللہ کا علم اور ان کی پابندی کا پکا ارادہ رکھتے ہوں، یہ قرارداد مطالبہ کرتی ہے کہ اقتدار کی مقدس امانت کے لئے تکلدت کی مقدس ہستیاں میدان میں آئیں، یہ قرارداد واضح طور پر یہ کہتی ہے کہ اب کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو اسلامی دستور کو کتاب و سنت سے اخذ کر سکیں اور پھر اسے موجودہ دورِ تمدن کے احوال کے اندر جاری کر سکیں؛ پھر یہ قرارداد یہ بھی چاہتی ہے کہ نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے جو اسلامی ماحول بنانے کے لئے پوری طرح اہل ہوں۔

مختصر یہ کہ یہ قراردادِ مقاصد ایک نیا معیارِ قیادت اپنے ساتھ لے کے نمودار ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے سیاسی اکابر اس صورت میں ہمارے لئے کار آمد بن سکتے، جب کہ (خدانخواستہ) ہمیں اپنے ملک میں ایک غیر اسلامی نظام چلانا ہوتا، لیکن اب جب کہ ہم نے دستوری طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ ہمیں اسلامی نظام قائم کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ نظام کی تبدیلی قیادت کی تبدیلی کو مستلزم ہے۔

"مطالبۂ نظامِ اسلامی" کی مہم جن دستوری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے شروع کی گئی تھی، الحمدللہ کہ وہ پورے ہو گئے۔ اب جماعت اسلامی کے کام کا دوسرا مرحلہ انقلابِ قیادت کا مرحلہ ہے، جو شاید "مطالبہ" کے مرحلے سے زیادہ مشکل اور پیچ در پیچ مرحلہ ہے۔

"انقلابِ قیادت" کی دعوت کے پھیلنے پر نہ معلوم کیوں بہت سے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔ حالانکہ جماعت اسلامی نے آج کوئی نئی بات نہیں کہی اور آج اپنے پروگرام میں کوئی جدید اضافہ نہیں کر لیا، بلکہ پاکستان بننے سے بہت پہلے جماعت کے اجتماعِ عام منعقدہ ۱۹۴۵ء میں اس کے امیر نے دعوتِ اسلامی کے تین پہلوؤں کی تشریح کرتے ہوئے "انقلابِ امامت" کو جماعت کے مقاصد میں شمار کیا تھا۔ ملاحظہ ہو!

"دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات":۔

"ہمارا اپنے آپ کو بندگیٔ رب کے حوالے کر دینا، اور اس حوالگی و سپردگی میں ہمارا منافق نہ ہونا بلکہ مخلص ہونا، اور پھر ہماری زندگی کو تناقضات سے پاک کر کے مسلمِ حنیف بننے کی کوشش کرنا

لازمی طور پر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس نظامِ زندگی میں انقلاب چاہیں جو آج کفر، دہریت، شرک، فسق و فجور اور بداخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے، اور جس کے نقشے بنانے والے مفکرین اور جس کا عملی انتظام کرنے والے مدبرین سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے اور اس کی شرائع کی قیود سے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔ جب تک زمامِ کار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی اور جب تک علوم و فنون، آرٹ اور ادب، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، قانون سازی اور تنفیذِ قانون، مالیات، صنعت و حرفت، تجارت، انتظامِ ملکی اور تعلقاتِ بین الاقوامی، ہر چیز کی باگ ڈور یہ لوگ سنبھالے ہوئے رہیں گے کسی شخص کے لئے دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اور خدا کی بندگی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا کر رہنا نہ صرف عملاً محال ہے، بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑ جانا ناممکن ہے۔" ——— فساق اور فجار اور خدا کے باغی اور شیطان کے مطیع دنیا کے امام و پیشوا اور منتظم رہیں، اور پھر دنیا میں ظلم و فساد، بداخلاقی اور گمراہی کا دور دورہ نہ ہو، یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے، اور آج تجربے و مشاہدے سے کالشمس فی النہار ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ پس ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم دنیا سے ائمۂ ضلالت کی پیشوائی ختم کر دینے اور غلبۂ کفر و شرک کو مٹا کر دینِ حق کو اس کی جگہ قائم کرنے کی سعی کریں۔" ——— ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ دنیا کی زمامِ کار فساق و فجار کے ہاتھ سے نکل کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے، بلکہ ایجاباً (ہماری دعوت یہ ہے کہ اہلِ ایمان و صلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یک رنگ اور نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح و پاکیزہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ ان تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریق پر چلانے کے لئے ضروری ہیں، اور صرف آراستہ ہی نہ ہو، بلکہ موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے ان اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کر دے۔"

جماعت کی دعوت کا یہ حصہ جب تک ہمارے اکابر برادران کے خیر اندیشوں کے لئے براہِ راست کوئی

عملی نتیجہ نہیں رکھتا، ان کے دلوں اور دماغوں کا سکون بحال چلا آرہا تھا۔ لیکن اب جب کہ ان الفاظ کا تعلق براہ راست ہمارے عملی مسائل سے پیدا ہونے لگا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ بعض لوگوں میں اضطراب کی ایک لہر اُٹھ رہی ہے۔

اس قسم کے لوگوں کی طرف سے "انقلابِ قیادت" کی خالص اسلامی دعوت کے خلاف آہستہ آہستہ چند اعتراضات کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم لازم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں غلط فہمیوں کو صاف کرنے کیلئے چند ضروری تصریحات پیش کر دیں۔ اس طرح اہلِ خلوص کے اطمینان کا سامان بھی ہو جائیگا اور بندگانِ اغراض کے موقف کا بودا پن بھی واضح ہو سکیگا۔ نیز تحریکِ اقامتِ دین کے کارکنوں اور ہمدردوں پر ان کی راہِ عمل اور زیادہ روشن ہو کے رہے گی!

کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ جماعتِ اسلامی کا مقصد اگر محض ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے — جیسا کہ جماعت کے اکثر ذمہ دار لوگوں کی تحریروں اور تقریروں میں تصریحات موجود ہیں — تو کیوں نہیں وہ قیادت کو اصلاح کیلئے ایک کھلا موقع دیتی؟ آہستہ آہستہ اربابِ قیادت سدھر جائیں گے۔ ورنہ یہ تو ایک عجیب صورتِ حالات ہے کہ ادھر تو اکابر نے قراردادِ مقاصد پاس کی اور ادھر اُن سے مطالبہ شروع کر دیا گیا کہ ایوانِ اقتدار خالی کر دو۔

بات اصل میں یہ ہے کہ فی الواقع جماعتِ اسلامی کے سامنے یہ مقصد تو ہے ہی نہیں کہ ہاتھ "زید" کے نہ ہوں، "بکر" کے ہوں یا "بکر" کے نہ ہوں، "زید" کے ہوں لیکن اس نے یہ بھی تو طے نہیں کر رکھا کہ جو ہاتھ آج پاکستان کی اجتماعی زندگی کی مشین پر متصرف ہیں، وہ اگر منکر کے خادم رہیں تو بھی بہرحال اُن ہاتھوں کو بدلنا جائز نہیں ہے۔ اس کو تو "معروف" کی خدمت کرنے والے ہاتھ چاہئیں، چاہے وہ موجودہ لوگوں کے ہاتھ ہوں یا نئے لوگوں کے۔ جماعتِ اسلامی سے زیادہ اس بات کی خوشی کسی کو نہ ہوگی کہ موجود ہاتھ "منکر" کی خدمت کے بجائے "معروف" کی خدمت کرنے کیلئے سرگرمِ عمل ہو جائیں، اور "شر" کے بجائے "خیر" کے فروغ کا ذریعہ بن جائیں لیکن اگر موجودہ ہاتھوں میں اس طرح کی فوری تبدیلی نمودار نہ ہو — اور یقیناً اب تک ایسے کوئی آثار و علائم دیکھنے میں نہیں آرہے، بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے — تو پھر زمامِ کار ان ہاتھوں میں جتنی زیادہ دیر تک رہیگی، سیاست و تمدن کی گاڑی غلط راستے پر اتنی ہی زیادہ دُور جا نکلے گی۔ اقتدار جتنا زیادہ غلط مقاصد کیلئے کام کریگا، اصلاح کی کوشش کی کامیابی اتنی ہی ابعد ہوتی جائیگی۔ یا تو ہماری قیادت میں تبدیلی اس طرح رونما ہونی چاہیئے تھی جس کی مثال حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تاریخ اسلام کے ورثے میں چھوڑی ہے اور یا اصلاح کے انتظار میں ایک غیر معین عرصہ بہرحال نہیں گذارا جا سکتا

پھر لوگوں کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دورِ حاضر میں قیادت کسی ایک فرد کو نہیں کہتے بلکہ آج کل زمامِ کار ایک بڑی جماعت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ پاکستان میں نہ تو لیاقت علی خاں صاحب کا نام قیادت ہے، نہ محض اُنکی کیبنٹ کو قیادت کہہ سکتے ہیں، بلکہ مرکز میں اور صوبوں میں کئی سو افراد کی ایک ٹیم جو پاکستان کے موجودہ نظم و نسق کو چلانے کیلئے پھیلی ہوئی ہے اس ساری کا نام قیادت ہے۔ اس ٹیم کا ایک حصہ وہ ہے جو حکومت کے سارے کاروبار کو اندر سے کنٹرول کرتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو ایوانِ حکومت سے باہر عوام میں سیاست اور معاشرہ کی سربراہ کاری کرتے ہوئے اندر کی طاقت کو خارج سے تقویت بہم پہنچاتا ہے۔ ان دو گونہ عناصر کی مجموعی لیڈر شپ ہے، جس پر گفتگو کی جارہی ہے اور ساری لیڈر شپ کو بدلنا ہمارا مقصود ہے، نہ کہ کسی شخص خاص کو، یا کسی کیبنٹ کے چند وزراء کو۔ اب قیادت کے اس وسیع تصور کو سامنے رکھ کے سوچیے کہ اتنی بڑی ٹیم کا از سرتا پا بدل جانا امکانِ عقلی کی حیثیت سے کتنا ہی ممکن ہو، لیکن امکانِ عملی کے دائرے سے بہرحال خارج ہے۔ پھر سوال یہ بھی تو ہے کہ اس ٹیم کے اندر سے جو فرداً فرداً فوری اصلاح کا ثبوت دیتے بھی ہیں وہ بھی صرف نیت، خیالات اور عادات و اطوار کی تبدیلی تو پیدا کر دکھائینگے لیکن آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ کتاب و سنت کا علم کسی طرح ان حضرات کے سینوں میں لا کے بھر دیا جائے، انکے دماغ اسلام کے دستور و قانون کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی کے ماہر ہو جائیں، انکے ذہن اسلامی نظام کے مختلف مسائل کو حل کرنے کیلئے یکایک اجتہادی بصیرت کے سرچشمے بن جائیں! اس طرح کی تبدیلیاں، جن کا تقاضا اسلام کرتا ہے، اگر مثلاً ایک سو افراد میں نہیں بلکہ چند سو یا چند ہزار افراد کی ٹیم کے اندر پیدا ہو سکیں تو پھر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی ہاتھوں کو بدلنے کی خواہشمند کبھی نہ تھی، لیکن اگر ایک پوری ٹیم فرنگی نظام کو چلاتے چلاتے یکایک اسلامی نظام کو چلانے کی قابلیتوں سے مسلح نہ ہو سکے۔ جو عملاً ناممکن ہے، تو آخر ان ہاتھوں میں کونسا تقدس موجود ہے جس کے پیشِ نظر زمامِ کار انہی کے قابو میں چھوڑی جانی لازم ہو!

اصل سوال تو یہی ہے، پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام و نفاذ۔ جتنا جلد اور جتنے بھلے طریق سے یہ ممکن ہو۔ پس اس مقصد کیلئے کارکنوں کی ایک ٹیم اگر اہل نہ ہو، بلکہ اہل تر لوگوں سے ایک نئی ٹیم مرتب کی جاسکتی ہو تو آخر اس تبدیلی کو کیوں بپا نہ کیا جائے؟ یہ طریقِ کار آخر کیونکر معقول ہو سکتا ہے کہ مندر کے مسجد بن جانے کے بعد بھی اسکی امامت و تولیت بہرحال انہیں لوگوں کی تحویل میں رہنے دی جائے جو مندر کے پروہت رہ بنتے چلے آرہے تھے، اور جب تک امامت و خطابت کی قابلیتیں ان میں پوری طرح نشو و نما نہ پالیں، قیامِ صلوٰۃ کا اہتمام ہی نہ کیا جائے۔ کوئی پوچھے تو کہہ دیا جائے کہ ہم نے تو انہی حضرات کرام کو اصلاح کا موقع دے رکھا ہے، اور ان میں تبدیلیوں کے رونما ہونے کا انتظار کر رہے ہیں! اس طرح کی روش تو معاملے کی ترتیب کو بالکل الٹ دیتی ہے، یعنی مقصد تو یہ ٹھہرا کہ فلاں خاص قیادت کو بہرحال برقرار رہنا چاہیے، خواہ ایک نظام جس کے قیام و نفاذ کا فیصلہ ہو چکا ہو، اُس کے تقاضے پورا کرنے کیلئے ضروری صلاحیتیں موجود نہ ہوں، نہ ان کے پیدا ہونے کے

انتظار میں ایک غیر معین مدت کیوں بسر گزارنی پڑے — سیدھی بات یہ ہے کہ اسلامی نظام کیلئے نئی قیادت بہرحال لازمی ہے اور اسے جلد از جلد برپا ہونا چاہیئے۔ رہا یہ امر کہ موجودہ قیادت کی ٹیم میں اگر کچھ افراد اصلاح پذیر ہو جائیں تو ان کا کیا بنے گا، سو یہ واضح ہے کہ اگر اسلام کے معیار قیادت پر کچھ پرانے لوگ اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرنے کے بعد پورے اتر سکیں اور رسمی عام کو مطمئن کر سکیں تو نئی قیادت کی صفوں میں ان کے لئے یقیناً جگہ پیدا ہو سکتی ہے۔

بعض گوشوں سے جماعت کو یہ طعنہ دینے کی ابتداء بھی ہو رہی ہے کہ جماعت اسلامی بھی اقتدار کی بھوکی ہے اور اب تک ساری ادیان اسی مقصد کیلئے طے ہو رہی تھیں۔ ابتداءً اس مقصد کو اخفا میں رکھا گیا تھا لیکن اب موقع آنے پر یہ مقصد کھل کے سامنے آ رہا ہے۔

معاذ اللہ، اگر جماعت اسلامی کا کوئی فرد اس نیت کیساتھ بھی جماعت میں آیا ہو کہ اس کا اصل مقصود عہدے اور وزارتوں پر قبضہ کرنا ہو یا کسی کارکن کے متعلق یہ حقیقت اگر جماعت کے علم میں آ جائے تو وہ اپنے دائرے میں اس کے وجود کو ایک لمحہ کیلئے گوارا کرنے پر بھی تیار نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف انقلاب قیادت کی داعی ہونے کی حیثیت سے جماعت کی دینی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ فاسد قیادت کو صالح قیادت سے بدلے۔ وہ اپنے لئے کسی طرح اس حالت کو جائز نہیں سمجھتی کہ زندگی کے سارے معاملات فاسقین کے ہاتھوں میں رہیں اور وہ صالحین کو اپنے ساتھ جمع کر کے ایک گوشۂ خمول میں پڑی رہے۔ فسق کی قوت جو پاکستان اور ساری دنیا میں انسانیت کی گردن پر سوار ہے اسے بہرحال برطرف کرنے کی سعی کرنا جماعت کی عین اسلامی ذمہ داری ہے، جیسا کہ اوپر کے ایک اقتباس سے واضح ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی وجہ سے اگر اس پر جاہ پسندی کا الزام عاید کیا جائے تو یہ بہرحال اس کام کے کرنیوالوں پر ہمیشہ عاید کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی دعوت انقلاب کو سن کر فرعون نے بھی یہی کہا تھا کہ تم لوگوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ۔ کہ زمین میں تم کو سیاسی برتری حاصل ہو جائے۔ پھر حضرت عیسیٰؑ پر بھی "یہودیوں کا بادشاہ" بننے کی خواہش کا طعنہ چسپاں کیا گیا تھا۔ خود نبی صلعم کو بھی دعوت حق سے روکنے کیلئے تاج عرب کی پیشکش اسی مفروضہ کی بنا پر کی گئی تھی کہ شاید آپ بادشاہت کے حریص ہیں۔

درحقیقت یہ الزام تراشی فسق کی قیادت کا ایک آخری حربہ ہے جسے وہ صالحیت کا راستہ روکنے کیلئے استعمال کرتی ہے۔ لیکن اگر پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ صالحیت کی طاقت نے فسق کو شکست دینے کی کوششیں اس الزام کے ڈر سے روک دی ہوں تو اب بھی انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا کہ جماعت اسلامی اس الزام کے ڈر سے دبک کے بیٹھ جائے۔ یہ ایک عجیب صورت حال ہے کہ اگر فسق کی طاقتیں اقتدار کو اپنی خواہشات و اغراض کے مطابق خدا کی حدود سے آزاد ہو کر استعمال کرنے کیلئے ہاتھ میں لینا چاہیں تو اس پر تو کوئی اضطراب بپا نہ ہو، لیکن اگر صالح عناصر کے ذریعے اقتدار کو حدود اللہ کا پابند بنانے کی کوئی جدوجہد شروع کی جائے تو اس صورت میں غضب ناک

پرستی کا فتنہ باقاعدہ ایک ہتھیار کے طور پر کام میں لایا جانے لگے۔ اگر ہم اپنے مقصد کی خدمت میں مخلص ہیں تو یاد رکھیے کہ اس فرسودہ ہتھیار کو ہم کامیاب نہ ہونے دیں گے۔

پھر ایک اعتراض موجودہ اقتدار کے پرستاروں کی طرف سے یہ بھی اچھالا جا رہا ہے کہ ملک نازک حالات میں گھرا ہے اور متعدد پیچیدہ مسائل اور ٹھوس خطرات اس کے گرد منڈلا رہے ہیں، اس حال میں انقلاب قیادت کی صدا بلند کرنے سے قوم کی طاقت کمزور ہو جائے گی۔ یہ دلیل ٹھیک اس دلیل کی ضد ہے، جو ایسے موقع پر پوری طرح راست آتی ہے یعنی اصل میں استدلال تو یہ ہونا چاہیے کہ ملک چونکہ نازک حالات میں گھرا ہے اور پیچیدہ مسائل اور خطرات اس کو چیلنج کر رہے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ایک مضبوط، صالح اور اہل تر قیادت جلد از جلد بروئے کار لائی جائے لیکن یہاں منطق بالکل الٹ دی گئی ہے۔

قاعدے کی بات ہے کہ عام حالات میں جیسی تیسی قیادت ہو، کام چلتا رہتا ہے لیکن جونہی کوئی پیچیدہ صورت حالات خطرات کو لیے کے نمودار ہوتی ہے، زندہ قومیں فوراً اپنے لیے مضبوط سے مضبوط قیادت فراہم کرنے کی فکر کرتی ہیں اور ہمیشہ نازک حالات ہی میں سیاسی اور فوجی قیادتوں میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ وزارتیں سخت خطرات کا سامنا کرتے وقت بدلتی ہیں اور فوجی کمانڈر جنگ کے نازک ترین مراحل میں تبدیل ہوا کرتے ہیں۔ آج ہم اگر سخت پیچیدہ مسائل سے دوچار ہیں تو عین یہی وہ لمحہ ہے جب کہ ہمیں صالح ترین قیادت کو سامنے لانا چاہیے، ورنہ اگر بعد میں حالات قابو سے باہر ہو گئے تو پھر کوئی بہتر سے بہتر قیادت وقت گزرنے کے بعد ان کو دوبارہ نہ لا سکے گی۔

مہاجرین، مزارعین اور مزدوروں کے داخلی مسائل کے علاوہ اس وقت پاکستان کو بین الاقوامی مسائل میں اپنے لیے ایک ایسی محتاط اور آزاد پالیسی کو نشوونما دینا ہے جو اسے آنے والی ہولناک ترین جنگ عظیم کو سلامتی سے عبور کرنے کے قابل بنا سکے اور دنیا کی دو بڑی طاقتوں ——— سفید شہنشاہیت اور سرخ شہنشاہیت ——— میں کوئی بھی اسے اپنے لیے اڈے یا آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال نہ کر سکے۔ یہ کام ایک صالح اور ہوشیار قیادت کے برسرِ عمل آنے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پھر کشمیر کا مسئلہ بھی ایک زیرک تر اور جری تر قیادت کے ناخن گرہ کشا کا منتظر ہے اور اس کے ساتھ انڈین یونین سے دوسرے معاملات میں عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی انقلاب قیادت کے سوا اب کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔ تیسری طرف کمیونزم کا طوفان ہمارے دروازوں پر دستک دے رہا ہے اور یہ حقیقت محتاج استدلال نہیں کہ موجودہ قیادت اس طوفان کو روکنے کے لیے مسلم سوسائٹی کے قلعے کی مضبوطی کا نہ کوئی سامان اب تک کر سکی ہے، اور نہ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ اسلام کے اصولوں

کوئی معاشی تنظیم کی اساس بنا کر کوئی ٹھوس تبدیلیاں برپا کر سکے گی۔

وقت انتہائی شدت سے تبدیلی قیادت کا مطالبہ کر رہا ہے اور جماعت اسلامی اس کے سوا کسی جرم کی مجرم نہیں ہے کہ وقت کے اس معقول ترین مطالبہ کو وہ سیاسی فضاؤں میں نمایاں کر رہی ہے۔ اس فرض کی ادائی میں اگر اسے جاہ طلبی کا الزام بھی مملکت کے مفاد کی خاطر برداشت کرنا پڑے تو یقیناً اس کے لئے لازم ہے کہ یہ ایثار بھی کر گزرے۔ الحمد للہ کہ وہ اس کے لئے ہمہ تن تیار ہے۔

کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ موجود راہ کاروں کے علاوہ قوم کوئی بہتر قسم کے افراد رکھتی ہی نہیں۔ بلکہ جماعت سے یہ دریافت کیا جاتا ہے اور شاید آگے چل کے قدم قدم پر دریافت کیا جائیگا کہ نئی قیادت ہے کہاں؟

اس سوال کے جواب میں کچھ عرض کرنے سے پہلے پھر قیادت کے وسیع تصور کی طرف توجہ کر دینا ضروری ہے۔ نئی قیادت کے معنی اگر ایک خاص فرد کے نہیں ہیں تو یقیناً اس کی نشاندہی کی صورت بھی نہیں ہے کہ کسی ایک شخص کا نام پیش کر دیا جائے کہ فلاں کو ہٹا کر فلاں کو سامنے لانا مقصود ہے۔ پھر انقلاب قیادت کے معنی چونکہ یہ بھی نہیں کہ مرکز کے کابینہ کے پانچ سات افراد کی جگہ نئے پانچ سات افراد کو مناصب پر متمکن کیا جانا ہے۔ اس وجہ سے چند آدمیوں کے ناموں کی فہرست علیحدہ کے سامنے رکھ دی جائے۔ بلکہ درحقیقت ایک نئی ٹیم مطلوب ہے جو نئے اصولوں پر سارا کاروبار مملکت کامیابی سے چلا کر دکھائے۔ قیادت کے اس تصور کے پیش نظر نئی قیادت پر اگر غور کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ کیا ہمارے ملک میں سو دو سو چار سو اشخاص ایسے پائے جاتے ہیں:-

ا:- جو اسلام کا پورا پورا علم اسکے اصل مآخذ کے ذریعے حاصل کئے ہوئے ہوں اور نظام اسلامی کو چلانے کے لئے اسلامیات میں مجتہدانہ بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کی عالمگیر سیاست اور مختلف نظام ہائے باطل کو سمجھتے ہوں اور عصر رواں کے تمدنی تقاضوں سے اتنے آگاہ ہوں کہ اسلام کے اصولوں سے آج کی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کر سکیں۔

ب:- اور جو اپنی شخصی اور پبلک زندگی کے اعتبار سے بے داغ سیرت کے مالک ہوں کہ ان کی دیانت و امانت پر بھروسہ کیا جا سکے۔

اگر ایسے افراد فی الواقع سو ڈیڑھ سو کی تعداد میں بھی ہماری سوسائٹی فراہم نہیں کر سکتی تو پھر ہم کو کسی دن فرصت نکال کر اپنی فاتحہ خوانی کی مجلس منعقد کر لینی چاہئے، کیونکہ اتنے ہولناک قحط الرجال اور بصیرت و اخلاق کے اتنے شدید دیوالیہ پن کے ساتھ کوئی قوم کبھی پنپ نہیں سکی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے ——— اور جماعت اسلامی یہ دعویٰ رکھتی ہے کہ ایسا نہیں ہے ——— تو اگر پوری قوم میں سے مذکورہ بالا اسلامی معیار کے کم سے کم سو ڈیڑھ سو افراد بھی حاصل ہو سکیں تو پھر انقلاب قیادت عمل میں آسکتا ہے۔ ایک نئی ٹیم جب میدان میں آتی ہے تو پرانی ٹیم سے ٹوٹ ٹوٹ کر لوگ اس میں شامل ہونے کے لئے اپنے آپ کو بدل لیتے ہیں، اور وہ پرانے کارکنوں میں سے ایک اچھے جوہر کو ساتھ لے کر جب پورے معاشرہ پر اثر انداز ہوتی ہے تو پھر مسلسل نئے معیار کے نئے کارکن سوسائٹی میں سے برآمد ہونے لگتے ہیں۔

ہمارے ہاں قحط الرجال یقیناً اس خطرناک حد تک پہنچا ہوا نہیں ہے۔ دینداری اور شرافت کے پاس آج بھی اس سے زیادہ اور بہتر مردان کار موجود ہیں، جتنے اور جیسے فسق کی طاقت نے فراہم کئے ہیں۔ مشکل صرف یہ رہی ہے کہ دینداری اور شرافت کو انگریزی نظام نے زندگی کے مسائل پر اثر انداز ہونے سے الگ کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کی وجہ سے ہمارا بہترین جوہر ہماری آخری صفوں میں گوشۂ خمول میں منتقل ہو گیا ہے۔ جماعت اس جوہر کو ہر طرف سے سمیٹ کر برسر عمل لانا چاہتی ہے۔ اب فسق کی طاقت کو پیچھے ہٹ کر انہیں گوشہ ہائے خمول میں جانا پڑیگا جن میں اب تک تقویٰ اور صالحیت کے جوہر کو محصور رکھا گیا ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر ایک اصول اور مقصد کے لئے کام کرنے والے لوگ کسی مرکز تنظیم پر سمٹنے لگتے ہیں تو لازماً ایسی منظم طاقت کے اندر سے ایک نئی قیادت رونما ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی نے اب تک یہی کام کیا ہے کہ اس نے ایک مقدس اصول و مقصد پر کام کرنے کے لئے قوم کے صالح عناصر کو مجتمع اور منظم کیا ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ یہ تنظیمی عمل قطعی طور پر ایک نئی قیادت کا ہیولیٰ ہے۔ پس یہ کہنا کہ انقلاب قیادت کے لئے کارکنوں کا کوئی مایوس کن قحط ہے، محض موجودہ غلط قیادت کے پرستاروں کا ایک حوصلہ شکن پروپیگنڈہ ہے ——— اور کچھ نہیں!

اس قسم کے اعتراض اٹھانے والوں کی خدمت میں آخری گذارش یہ ہے کہ وہ براہ کرم خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ جماعت اسلامی کوئی وقتی اور جزوی مقاصد کے لئے کام کرنے والی محض اصلاحی سی انجمن نہیں ہے جس کا کام صرف

قرار دادیں پاس کر کے "عالم بالا" تک درخواستیں کر دینے تک محدود ہو اور اس کی جتنی دعائیں سن لی جائیں، ان کو غنیمت سمجھ کر پڑی رہے اور حالات کی تبدیلی کے لئے براہِ راست ان میں کوئی مداخلت نہ کرے پھر وہ کوئی مثبت قسم کا کام کرنے والی جماعت بھی نہیں ہے، بلکہ اس کے سامنے ایک مثبت پروگرام ہے، جو اس سے منفعلانہ مسلک کا نہیں، فاعلانہ اقدام کا طالب ہے۔ یہ فاعلانہ مگر پُرامن اقدام جس طرح اس نے مطالبہ کی مہم میں کیا تھا، اسی طرح وہ انقلابِ قیادت کی مہم میں بھی مثبت سرگرمیوں سے یقیناً کام لے گی۔

اگر انتخابات دور رہتے تو شاید اسے ان کو قبل از وقت منعقد کرانے کے لئے یا دوسرے جمہوری طریقوں سے انقلابِ قیادت کو برپا کرنے کے لئے کوئی مخصوص پروگرام اختیار کرنا پڑتا، لیکن اب چونکہ انتخابات بالکل سامنے ہیں، لہٰذا اب اس پیش نظر موقع ہی کو وہ اصلاحِ احوال کے لئے پوری طرح استعمال کرے گی۔ اس کی نگاہ میں آئندہ انتخابات اسلام اور جاہلیت یا صالحیت اور فسق کا ایک کھلا کھلا معرکہ ہوں گے۔ اس معرکہ میں فسق کو شکست دینے کیلئے صالحیت کی اور جاہلیت سے اقتدار سلب کرنے کیلئے اسلام کی پوری پوری حمایت و تائید نہ کرنا قوم سے دشمنی اور اسلام سے صریح غداری ہے۔ جماعت اگر اسے گوارا نہیں کرسکتی کہ قرارداد مقاصد کے پاکیزہ الفاظ کی توہین ہو اور یہ اسلامیت کا اعلان کچھ لوگوں کا سیاسی مہرہ بن کر ایک کھوٹے سکے کی طرح اپنی قدر و قیمت کھو دے تو اسے لازماً اس قرارداد مقاصد کے تقاضے پورے کرنے والے اہل ترین افراد کو سوسائٹی میں سے چھانٹ کر سامنے لانے کے لئے عوام کو تیار کرنا ہوگا اور پورے صالح عناصر کو ایک صف میں منظم کر کے میدان میں لانا ہوگا، ورنہ اگر عملی حالات میں مداخلت سے اجتناب کرتے ہوئے محض وعظ کہنے اور تجاویز پاس کرنے تک اس کی سرگرمیاں محدود ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے بے شمار دینی و دنیوی انجمنیں موجود ہیں، ان میں جماعت اسلامی کے نام سے ایک اور انجمن کا اضافہ کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہ تھی۔

رہا یہ امر کہ انتخابات میں کیا کام کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے، اس کے متعلق ہم انشاء اللہ آئندہ اشارات میں گفتگو کریں گے۔

معاشی ناہمواریوں کا اسلامی علاج

نعیم صدیقی

یہ تقریر جماعت اسلامی (پاکستان) کے سالانہ اجتماع منعقدہ ۶، ۷، ۸ مئی ۱۹۴۹ء میں بطور خطاب عام پیش کی گئی تھی عنوان کے تقاضے جتنے وسیع تھے۔ تقریر کا وقت اتنا ہی کم تھا اس وجہ سے بعض حصص کو ساقط کرنا پڑا اور بعض تفصیل طلب مواقع پر بالجبر اجمال سے کام لیا گیا۔ بہرحال تقریر کو مرتب کرتے ہوئے اس کے تشنہ پہلوؤں کی تکمیل اب کر دی گئی ہے۔ (ن۔ ص)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ !

پاکستان میں برطانوی اقتدار اپنے ترکے میں جس معاشی و اقتصادی نظام کو چھوڑ کر رخصت ہوا ہے۔ وہ پوری طرح سے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ فطرت پر مبنی ہے۔ اس نظام باطل کے اوپر کڑے پہرے قائم ہیں، اس کے گرد قانون کی سنگینیں تنی ہوئی ہیں، اس کے چاروں طرف سرمایہ دارانہ روایات کے خاردار جنگلے لگے ہیں؛ اور اس کو لٹریچر اور تعلیم کی ایک شہر پناہ نے اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے۔ اس نظام کے جاں نثار محافظ ہمارے وہ بھائی ہیں جن کے ذاتی اور خاندانی مفاد اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور جن کے ذہنوں پر اس نظام کی فوقیت کا تصور انگریزی حکومت نے سالہا سال کی محنت سے مسلط کیا ہے۔

یہ اقتصادی نظام جو ہمارے سروں پر چھایا ہوا ہے، اس سے پاکستان ہی میں نہیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں خطرناک مفاسد پیدا ہو رہے ہیں، اور انسانیت ہر جگہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہے۔ اس نظام کا یہ خاصہ ہے کہ یہ افراد اور جماعتوں اور قوموں کو دولت پرست بناتا ہے، یہ دولت کو چند مرکزوں میں سمیٹتا اور اس کی گردش کی رفتار کو گھٹاتا ہے۔ یہ امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بناتا ہے یہ معاشی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے۔ یہ سوسائٹی کو طبقات میں بانٹ کر باہم لڑاتا ہے؛ یہ بین الاقوامی فضا میں جنگوں کے طوفان بپا کرتا ہے۔ اور طاقتور قوموں کو کمزور قوموں کی صیادی میں مبتلا کرتا ہے چنانچہ اس نظام کے تحت خدا پرستی، اخلاق، امن و سکون، اخوت و مساوات وغیرہ کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

نظام سرمایہ داری کے مفاسد پر کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں۔ ہم روز اپنی آنکھوں سے اسکے کرشموں

کر دیکھتے ہیں کون سا دل ہے جو اس کی ناوک افگنیوں سے چھلنی نہیں ہو رہا تقویٰ کی کتنی ہی کمائیاں ہیں جو اس نظام کے ہتکنڈوں کی قربان گاہوں پر بے دردانہ بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ مکرم وجود کے کتنے ہی حاصل ہیں جو اس نظام کے خداوندوں کی نذر کر دیئے جاتے ہیں۔ ایمان و اخلاق کی، اور ذہانت و فطانت کی کتنی ہی متاع ہائے گراں مایہ ہیں جو اس نظام کی منڈی سے روٹی کے چند لقمے خریدنے کے لئے ہر صبح اور ہر شام کو ہماری آنکھوں کے سامنے لٹائی جاتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستان کی کتنی ہی معصوم بیٹیوں کی عصمتوں کا خراج اس نظام کے خداوند اس ہر رات کی تاریکی میں وصول کر لیتے ہیں! کون اس کا حساب بتا سکتا ہے کہ حسب و نسب اور عزت و آبرو کے کتنے خزانے ہیں جو ہر دن کی روشنی میں اس نظام کے اکابر کے قدموں پر نچھاور کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک ایک سکے کی خریداری کے لئے کتنے ہی جوہر قابل ہیں جو اپنے آپ کو اس نظام کے چور بازار میں نیلامی کے لئے پیش کرتے ہیں یہاں زندگی کرنے کے لئے انسانوں کے گلے کے گلے ہیں جو گھوڑوں اور بیلوں کا رتبہ قبول کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں یہاں والدین اپنی اولادوں کو سالہا سال تک پالنے پوسنے کے بعد بالکل اسی طرح لا بیچتے ہیں جس طرح گوالے اور گڈریئے بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں قصاب خانوں میں لا کر بیچا کرتے ہیں۔

یہ نظام از سرتاپا ایک مہلک معصیت، ایک مہذب بدمعاشی، اور ایک منظم چور بازاری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فطرت اس کو گوارا کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اور اس کے خلاف پوری دنیا میں مظلوم عناصر زور کر رہے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے چھ کروڑ باشندوں میں سے چند سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو چھوڑ کر پوری ملت اس نظام سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے۔

مرض کا علاج مرض سے سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مفاسد کے خلاف انسانی فکر نے جب زور کرنا شروع کیا تو کمیونزم ان مفاسد کی اصلاح کے لئے میدان میں نمودار ہوا چنانچہ دنیا کے اکثر گوشوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور خاص طور پر روس کی سرزمین نے اس نو وارد طاقت کو پورا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اچھی طرح اپنے کمالات کا مظاہرہ کرے لیکن کمیونزم سرمایہ دارانہ نظام کا جو علاج اپنے ساتھ لایا ہے وہ خود مرض سے کم نہیں یہ معالج اصلاح کی ذمہ داری لینے کے بجائے انتقام کا پروگرام ساتھ لاتا ہے یہ بیمار کے روگ کا علاج نہیں کرتا، بلکہ اسے اس بات کی سزا دینا چاہتا ہے کہ تو بیمار کیوں ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں جراح کا نشتر نہیں ہے۔ بلکہ قصاب کا چھرا ہے کمیونزم سرمایہ داری کے خلاف چڑھے جذبات کا ایک ہجوم لے کے آتا ہے۔ اور ایک انتہا پسندی کے مقابلے میں دوسری انتہا پسندی کو ابھارتا ہے۔ اس کے پیش نظر مرض کا علاج مرض سے کرنے کی ایک مکروہ سکیم ہے۔

کیمونزم کے طریق علاج میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہ انسان کی اصلاح اندر سے کرنے کے بجائے باہر سے اصلاح کو اس پر جبراً مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہ دولت مند طبقے کے افراد اور محنت پیشہ طبقے کے افراد میں جذبۂ اخوت و تعاون پیدا کرنے کے بجائے ان کو باہم لڑانا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لئے افراد انسانی سے آزادی اور حق ملکیت یا دوسرے لفظوں میں خدا کی عطا کردہ خلافت و نیابت کے شرف کو پوری طرح چھین لینا چاہتا ہے۔ اور انسانی سوسائٹی کو ڈھور ڈنگروں کے ایک گلے کی طرح چند گڈریوں کے حوالے کر دینا چاہتا ہے۔ پھر کیمونزم ایک ملک میں اپنی معاشی اسکیم کو جاری کرنے کے لئے لازم سمجھتا ہے کہ وہاں کے نظام اجتماعی کو ایک مرتبہ پوری طرح تہ و بالا کر دے۔ اور مذہب، اخلاق، معاشرت اور قانون کی ساری قدروں کو توڑ پھوڑ دے۔ پھر اس "مرجع دین" کا بیت المقدس چونکہ روس میں واقع ہے۔ لہذا یہ مجبور ہے کہ جس ملک و قوم کو اپنے اثر میں لے اس پر روسی امپیریلزم کو مسلط کر دے۔ ان امور کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری کے "تسمہ پا" سے نجات پانے کے لئے کیمونزم کے "مرغ باد" کو قبول کرنا ایک خطرناک حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

ایک سوال ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو رجحانات کھل رہے ہیں۔ ان کی سربراہی کرنے والوں کو اب جذباتی پن سے الگ ہو کر گہرے غور و فکر سے کیمونزم کا جائزہ جائزہ لینا چاہئے۔ اور خوب اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرنا چاہئے کہ سرمایہ داری سے نجات پانے کے لئے:

ا:۔ کیا ہم اپنی مسلم سوسائٹی کو افتراق اور تصادم کا لقمہ بننے دیں۔ اور دین و اخلاق اور تمدن و معاشرت کی ان ساری قدروں کو تہ و بالا ہو جانے دیں، جو ہماری اجتماعی زندگی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتی ہیں؟ کیا ہم مسلم اور مسلم کو روٹی کے بٹوارے پر لڑا مروانے کی اس ترغیب کو جاری رہنے دیں جو کیمونزم کی طرف سے دلائی جا رہی ہے؟ کیا یہاں مسلمان کے چھرے سے مسلمان کی گردن کٹوانے کا کوئی پروگرام ہمیں پھیلنے دینا چاہئے؟

ب: کیا ہمیں پاکستان کی زرخیز مملکت کو اس خطرے میں ڈالنا چاہئے۔ کہ آج جب کہ اس کی قومی اقتصادیات بالکل ابتدائی درجے میں ہیں۔ اس کے ڈاک خانوں کو جلایا جائے۔ اس کی ریل گاڑیوں کو الٹا جائے۔ اس کی پٹڑیوں کو اکھاڑا جائے۔ اس کے پلوں کو ڈائنامائیٹ سے اڑایا جائے۔ اور اس کے خزانوں کو لوٹا جائے؟

ج:۔ کیا اپنی ساری آزادی فکر و عمل کو ہم ان چند افراد کے حوالے کر دینے پر تیار ہیں جو ہم چھ کروڑ افراد کو قومی ملکیت کے کولہو کے بیل بنا کر انسانیت کے شرف سے معزول

کر دینا چاہتے ہیں؟

د:- کیا اس جماعت کی پکار پر ہم لبیک کہہ سکتے ہیں جو علی الاعلان پاکستان کی سرزمین میں سرخ فوجوں کے داخلے کی خوشخبری سنا رہی ہے۔ اور ایک دردناک غلامی کا پیغام دے رہی ہے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ تو ایک کرخت نہیں کے سوا اس کا کوئی اور جواب ایک مسلمان قوم دے ہی نہیں سکتی۔

پھر کمیونزم کا علاج ہمارے لئے اس وجہ سے بھی ناقابل قبول ہے کہ ہم موجودہ معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے اس سے بہتر اور پاکیزہ علاج خود اپنے پاس رکھتے ہیں ہم دوسروں کی طبی امداد کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ ہمیں ساری دنیا کے لئے معالج بنایا گیا ہے ہم پورے اسلام پر ایمان لائے ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کی رہنمائی کو موجب فلاح تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام اگر نماز روزے کا دین ہے۔ تو وہ سیاسیات و معاشیات کا دین بھی ہے۔ وہ اگر مسجد میں صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ تو یقیناً بنک، کارخانے، کھیت اور بازار میں بھی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اسلام کے دین پر اگر نکاح و طلاق کے مسائل میں بھروسہ کرتے ہیں تو یقیناً سرمایہ و محنت کے مسائل بھی ہمیں اس کے اصولوں کی صحت پر یقین کامل ہے۔ اور ہونا چاہئے۔

پھر ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کہ ہماری دستور ساز اسمبلی نے اپنی قرارداد مقاصد کے ذریعے پوری ملت پاکستان کی طرف سے یہ بات طے کر دی ہے۔ کہ اب سرزمین پاکستان میں زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح اور ہر پیچیدگی اور ناہمواری کا علاج اسلام کے ان اصولوں کے مطابق کیا جائیگا جن کے مجموعے کا نام کتاب و سنت ہے خدا کی حاکمیت اور اس کی نیابت کے مقام پر فائز ہو جانے اور امانت اقتدار کو اس کی مقررہ حدود کی پابندی میں استعمال کرنے کا اعلان کر دینے کے بعد ہم دستوری طور پر بھی اس بات کے مجاز نہیں رہے ہیں کہ اسلام کے سوا اپنی نگاہیں کسی اور طرف اٹھائیں ——!

اب ہمارے سامنے زندگی کے سارے مسائل کا ایک ہی حل ہے۔ اسلام! اسلام ہمیں ان تمام مفاسد سے بچا سکتا ہے جو سرمایہ داری اور کمیونزم میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام بھلائیوں کو پوری طرح قائم کر دیتا ہے جو کسی ناقص شکل میں ان دونوں نظاموں کے اندر مخلوط ہیں۔

اسلام اور اقتصادی اصلاح اسلام چونکہ سالہا سال سے ایک نظام کی حیثیت میں برسر عمل نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے

چند متفرق احکام جن کا تعلق انفرادی زندگیوں سے تھا، لوگوں کے سامنے آسکے ہیں، اس وجہ سے یہ بدگمانی بہت پھیلتی رہی ہے، کہ شاید اسلام اجتماعی مسائل میں مداخلت کا کوئی پروگرام سرے سے رکھتا ہی نہیں اور شاید کچھ لوگ، خواہ مخواہ کھینچ تان کر اس کو سیاسی اور معاشی نظام کی حیثیت دے رہے ہیں۔ واقعہ یہ نہیں ہے۔ وہ حدید کی ایک آیت میں اسلام کا وہ مقصد بیان کیا گیا ہے، جس کے لئے انبیا مبعوث ہوئے۔ کتابیں نازل ہوئیں معرکۂ خیر و شر بپا کیا گیا۔ اور جس کے لئے سیاسی قوت فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا:-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ
اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

ہم نے اپنے رسولوں کو اس لئے دلیل دے کر بھیجا
اور ان کے ساتھ اس لئے "الکتاب" (ضابطہ) اور
"المیزان" (حکمت دینی)، کو نازل کیا، کہ انسان
عدل پر قائم ہو جائیں۔ اور اسی مقصد کے لئے
لوہا پیدا کیا جس میں شدید (سیاسی) قوت مضمر ہے
اور لوگوں کے لئے دوسرے فوائد ہیں۔

یہ آیت اپنے مفہوم میں بہت ہی صاف ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ دین کو اللہ تعالٰے نے صرف اس لئے مرتب کیا ہے۔ اور اس لئے انبیاء کو بھیجا اور کتابوں کو نازل کیا ہے کہ وہ اپنی تبلیغی جدوجہد سے سیاسی قوت فراہم کر کے دین کے نظام اجتماعی کو برپا کریں، اور اس کے تحت انسانوں کو قسط یعنی اجتماعی عدل پر جمادیں۔ ظاہر ہے کہ عدل کا قیام صرف مسجد کی صف بندی میں مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کے سارے معاملات، کو ناہمواریوں سے ہٹا کر راستی و یکسانی پر قائم کر دینا اسلام کا نصب العین ہے۔ یہ بات تو انسانی عقل ہی میں نہیں آسکتی۔ کہ زندگی کے کسی ایک، یا چند شعبوں کو دوسرے شعبوں سے الگ کر کے ان میں نظام عدل قائم کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسرے شعبوں میں کیسے ہی مظالم کارفرما ہیں۔ زندگی کے ایک شعبے کا بگاڑ دوسرے تمام شعبوں کو مریض بنا دیتا ہے۔ پس جس طرح کسی جسم میں کوئی حد بندی کر کے ایک طرف بیماری کی حالت برقرار رکھتے ہوئے دوسرے حصے میں صحت قائم کر دینا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کے بعض شعبوں میں فساد اور ناہمواریوں کو قائم رکھ کر بعض شعبوں میں قیام قسط کا پروگرام عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ چنانچہ اسلام اگر قیام قسط کی ....

دعوت دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پوری زندگی کے پورے مسائل میں مداخلت کرنے کا پروگرام لے کے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں سیاسی قوت کی اہمیت کی طرف واضح اشارہ موجود ہے، جس کو استعمال کرنے کی ضرورت کسی سیاسی و معاشی نظام ہی کے نفاذ اور قیام میں پیش آسکتی ہے۔ اسلام جس طرح خدا اور بندے کے تعلقات میں عدل چاہتا ہے اسی طرح والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی، حاکم اور محکوم، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور مزارع، تاجر اور گاہک کے تعلقات میں بھی راستی اور انصاف کی روح کو جاری و ساری کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کسی جزئی معاملے میں عدل نہیں چاہتا بلکہ ایک جامع نظامِ عدل برپا کرنے کے لئے آیا ہے۔

معاشی ناہمواریوں میں اجتماعی ہلاکت | قرآن نے ایک دوسرے موقع پر معاشی ناہمواریوں کو اقوام کی تباہی کا راز قرار دیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ "اذا اردنا ان نهلك قرية امرنا[1] مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا"۔

ان چند الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قانون بیان فرمایا ہے کہ جب ہم کسی بستی، کسی جماعت، کسی قوم اور کسی سوسائٹی کی ہلاکت کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہ صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ خوش حال لوگ اپنی بڑھتی ہوئی دولت کے نشے میں فسق کرنے پر اتر آتے ہیں۔ اور ہمارے قانون عذاب کے تقاضے پورے ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ عذاب وارد ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس سوسائٹی میں دولت کمانے کے ناجائز طریقے چلنے لگیں، اور کبر اور اسراف کے مظاہر ہوں، اور تقسیم دولت میں ناہمواری ہو۔ وہ سوسائٹی ہر لحظہ عذاب الٰہی کی زد پر رہے گی۔ جس اسلام نے اللہ تعالیٰ کے قانون عذاب اور معاشی ناہمواریوں کے اس تعلق کو واضح کیا ہے، وہ یقیناً انسانی سوسائٹی کو تباہی سے بچنے کے راہِ نجات بتانے کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ ہر نبی کی نبوت کا، ہر آسمانی کتاب کی ہدایت کا اور ہر اسلامی حکومت کے ذرائع و وسائل کا ایک واضح ہدف یہ ہے کہ وہ دولت کمانے اور خرچ کرنے کے طریقوں میں فسق پیدا ہونے میں مانع ہوں تاکہ وہ ناہمواریاں نہ پھیلنے پائیں جو ایک ملک یا مملکت کو تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔

ایمان و اخلاق کی حفاظت کی ذمہ داری | یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی جسے نبی صلعم نے خود بیان فرمایا ہے

[1] "امرنا" کے معنی بعض مفسرین متقدمین نے "کثّرنا" کے لفظ سے کئے ہیں، یعنی چند خوش حال لوگوں کی دولت بہت زیادہ حد تک بڑھنے لگتی ہے۔

نے کہا کہ ابومسلم جو کر رہے ہیں، اسے خوب سمجھتے ہیں، انہیں کہنے دو" ابومسلم نے فرمایا "انما انت اجیر استاجرک رب هذه الغنم لرعایتها فان هنات جرباها وداویت مرضاها وحبست اولاها علی اخراها وفاک سیدها اجرک الخ" تمہیں خدا نے بکریاں چرانے کے لئے مزدور رکھا ہے اگر تم ان کی صحت اور دوسری ضروریات کا خیال رکھو گے تو ان کا مالک (اللہ) تمہیں پوری مزدوری دے گا اگر تم نے یہ حقوق پورے نہ کئے تو تمہیں سزا ملے گی۔

اسلامی نظام کے مطابق حکومت اعزازی خدمت کا مقام ہے، یہ دولت کمانے اور ثروت کا ذریعہ نہیں۔ اس لئے مسلمان خلفاء کی زندگی فقیرانہ تھی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے لڑکوں کو ان کی متروکہ جائداد سے پانچ پانچ روپیہ سے بھی کم ملا۔ حضرت عمرؓ کی اپنی زندگی بہت سادہ تھی، چادر پر چمڑے کے کئی کئی پیوند لگاتے تھے۔ اسلام میں یہ ذمہ داری وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اپنی زندگی مشکلات کے حوالہ کر دیتے اور عوام کے لئے آسانیاں مہیا کرتے ہیں، اس لئے وہاں خیانت، رشوت اور کنبہ پروری کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسلامی اخلاق کی موت نے تباہی بپا کر دی ہے۔ صحیح بخاری میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:-

"قال اذا ضیعت الامانة فانتظر الساعة قال یا رسول اللہ وما اضاعتها قال وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة" (بخاری) جب امانت ضائع ہو جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ پوچھا گیا کہ امانت کے ضائع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا جب حکومتوں کے ذمہ دار نااہل لوگ قرار پانے لگیں تو قیامت کا انتظار کرو۔ الغرض نالائق قیادت اور نااہل عمال حکومت فی الحقیقت دنیا میں قیامت بپا کر دیتے ہیں۔ مشرقی پنجاب کے مظالم اور مغربی پنجاب کے لرزہ خیز حوادث کی تہہ میں لیڈروں اور ذمہ دار افسروں کی نااہلیت کے سوا آخر کیا سبب کام کر رہا تھا؟ اول تو انتقال آبادی کا فتنہ خود اکابر کی نالائقی کا نتیجہ تھا، اور اگر یہ ناگزیر تھا تو اسے پرامن طریق سے کیا جا سکتا تھا، مگر لوٹ کے خواہشمند امن کی آرزو کیوں کرتے؟

حکام کے اخراجات و طریق معیشت

اسلامی حکومت کے متعلق جو کچھ پہلے ذکر ہوا، اس کی تائید ان اخراجات سے ہوتی ہے جو بجٹ میں خلیفہ کے لئے طے پاتے۔ فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ بیت المال میں خلیفہ کا صرف اتنا حق ہے کہ گرمی اور سردی کے لئے دو چادریں لے لے اور ایک متوسط الحال آدمی کے برابر

اپنے کنبہ اور عیال کا خرچ اسے دے دیا جائے، اس کے علاوہ وہ باقی مسلمانوں کے برابر ہے۔ عہدہ داروں کو عہد لیتے کہ ترکی گھوڑے پر سواری نہ کرنا، میدہ اور چپاتی نہ کھانا اور حاجتمندوں پر اپنے دروازے بند نہ کرنا۔

امیر معاویہ کا قول ہے:۔ "ابوبکر لم یرد الدنیا ولم تردہ واما عمر فارادتہ ولم یردھا واما نحن فتمرغنا فیھا ظھرا لبطن" (البدایہ) ابوبکرؓ نہ دنیا چاہتے تھے اور نہ دنیا نے انہیں چاہا، عمرؓ کو دنیا نے پسند کیا لیکن عمرؓ نے دنیا کو ناپسند کر دیا، ہم تو دنیا میں لت پت ہو گئے۔ استغنا کی یہ کیفیت ہے جو اسلامی حکومت کے لئے امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور کتنا جامع تجزیہ ہے جو دونوں خلفاء کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

احساس ذمہ داری اور جذبۂ خدمت حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "لو ان جملا ھلک بشط الفرات لخشیت ان یسئل اللہ عنہ ابن الخطاب" اگر فرات کے کنارے پر اونٹ مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ عمرؓ کو اس کی بابت پوچھا جائے گا۔ طلحہ بن عبداللہ فرماتے ہیں حضرت عمر ایک رات ایک مکان میں تشریف لے گئے، مجھے بدگمانی ہوئی میں صبح اس مکان میں گیا وہاں ایک اندھی بوڑھی بے دست وپا عورت رہتی تھی، میں نے اس سے پوچھا تمہارے پاس رات کوئی آیا تھا؟ اس نے کہا یہ شخص مدت سے رات کو آتا ہے، میرا سامان سلیقہ سے رکھ جاتا ہے، مکان صاف کر کے کوڑا باہر ڈال جاتا ہے، طلحہ فرماتے ہیں، میں بہت شرمندہ ہوا کہ میں عمرؓ کے عیب تلاش کرتا ہوں؟

ایک رات حضرت عمرؓ مدینہ کے اطراف میں دوڑ رہے تھے، حضرت علیؓ نے وجہ دریافت کی، فرمایا بیت المال کے کچھ اونٹ گم ہو گئے ان کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے قبیلہ خزاعہ کا رجسٹر نکالا، اس کی بیوہ اور کنواریوں کے نام درج تھے، خلیفہ نے ہر ایک کا وظیفہ اس کے ہاتھ میں دیا۔ فرمایا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ہر علاقہ کا دورہ خود کروں اور مصیبت زدہ لوگوں کی شکایات خود سنوں۔ مجھے گمان ہے کہ حکام تساہل کرتے ہیں اور شکایات مجھ تک نہیں پہنچاتے۔

اسی فرض شناسی اور رعایا پروری کا یہ اثر تھا کہ لوگ حضرت عمرؓ سے بہت ڈرتے تھے "لم یکن عمر یحتمل الا ذرۃ وھی عصا صغیرۃ کالمخصرۃ کانت دائما فی یدہ اذا سار وکان الناس یھابونھا اکثر مما تخیفھم السیوف" (محاضرات ۲-۲۲) حضرت عمر کا درہ ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جو آپ کے

کے وہ تمدن کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ ایک شخص کسی کھلے جنگل میں داخل ہو کر جنگلی پھلوں سے جس بے تکلفی سے استفادہ کرتا ہے، وہ بے تکلفی وہ کسی ایسے باغ میں استعمال نہیں کرسکتا جس کے متعلق اسے معلوم ہوجائے۔ کہ اس کا کوئی مالک ہے۔ یہ محض زاویۂ نظر کا فرق ہے جس سے دونوں مواقع پر طرزِ عمل میں فرق پیدا کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح دنیا اور انسان کے متعلق مختلف اعتقادات مختلف طرزِ عمل پیدا کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھنے سے قدرتی طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری کے مفاسد کی اصل جڑیں وہ باطل معتقدات ہیں۔ جنہوں نے دنیا کو مادے کا کرشمہ، انسان کو حیوان، اخلاق کو نفع پرستی، اور تمدن کو انسانی طبقات کا اکھاڑہ قرار دیا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام آدمی کو ایک ایسا زاویۂ نظر دیتا ہے جس سے اس کے طرزِ عمل میں حد درجہ کا ذمہ دارانہ پن پیدا ہوجاتا ہے۔

قرآن صحیفۂ فطرت سے اخذ کردہ دلائل کا ایک انبوہ اس سچائی کو واضح کرنے کے لئے جمع کر دیتا ہے کہ کارخانۂ کائنات میں جو نظم، قانون، حسن اعتدال پایا جاتا ہے یہ ایک بااختیار خالق، ناظم اور حاکم کا کرشمہ کار ہے۔ اس کارخانے میں مادر پدر آزادی کی کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ وہ دوسری صداقت یہ سامنے لاتا ہے کہ انسان خالقِ کائنات کا "عبد" "خلیفہ" اور ایجنٹ ہے پھر وہ بتاتا ہے کہ جس طرح دنیا کے تمام موجودات کے لئے ضابطہ کار فرما ہے اسی طرح انسان کو جو شعور و اختیار دیا گیا ہے اس کے استعمال کے لئے بھی ضابطہ ہے جسے خدا کے انبیا لاتے رہے ہیں۔ پھر وہ بتاتا ہے۔ کہ یہ ارضی زندگی جس دائمی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے برا یا بھلا ہونے کا دارومدار موجودہ آزمائشی زندگی کے صلاح و فساد پر ہے۔

یہ تصورِ حیات اور عقیدۂ زندگی اس طرزِ عمل کی بنیاد بننے کے لئے قطعاً ناساز گار ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت افرادِ انسانی میں پیدا ہوجاتا ہے۔

نظامِ معاشیات اور اسلامی عقائد: یہ بنیادی عقیدۂ حیات جسے میں نے بیان کیا ہے، زندگی کے ہر شعبے کے لئے کچھ تفصیلی عقائد بھی مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی نظامِ معیشت میں افراد کی جد و جہد بعض خاص اعتقادی حدود کی پابند رہتی ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے:

۱۔ خدا کی رزاقی —— اسلام نے انسان کو پورا اطمینان دلایا ہے۔ کہ جس خدا نے تجھے پیدا کیا ہے اس نے تیری ضروریات کا انتظام بھی کیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا زمین میں حرکت کرنیوالا

کوئی ایسا جاندار نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے نہ لے رکھی ہو۔ پھر فرمایا خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ زمین و آسمان میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے، وہ تمہاری ہی ضروریات پوری کرنے کیلئے ہے۔ دراصل اس عقیدہ کو ذہنوں میں اتارنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسانوں میں اوچھاپن، کم ظرفی اور اس سے بڑھ کر رزق کے لئے ہاتھا پائی کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔ انہیں بھروسہ ہونا چاہئے کہ خزانوں کا ایک مالک خود ان کی ضروریات کی فراہمی کا ضامن ہے۔

۲۔ تفاوتِ رزق میں آزمائش ——— یہ ظاہر ہے کہ فطرت میں یہ پہلو ہے، اختلاف اور تفاوت کارفرما ہے چنانچہ افرادِ انسانی کی قابلیتوں میں، اپنی صلاحیتوں، جسمانی قوتوں اور پیدائشی اور اکتسابی سہولتوں کے لحاظ سے گوناگوں اختلافات ہیں جو نظام تمدن میں اپنا کام کرتے ہیں۔ صلاحیتوں کا اختلاف جدوجہد میں اور جدوجہد کا تفاوت کمائیوں میں تفاوت پیدا کرتا ہے۔ اس تفاوت کے متعلق قرآن بیان کرتا ہے کہ اس کے ذریعے انسان کو خیر و شر کے ایک امتحان سے دوچار کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی بھلائیوں اور برائیوں کو نمودار کر سکے! فرمایا۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ اٰتٰىكُمْ

خدا وہ ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں کی فوقیت اس لیے دی کہ وہ اپنے عطیات کے بارے میں تمہیں جانچے۔

اس ارشاد سے اللہ تعالیٰ کا مدعا یہ ہے کہ تم زمین میں شتر بے مہار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو، بلکہ تم ہمارے نائب اور ہمارے مقرر کردہ کارندے ہو اور تمہارا کام بے لگامی سے دنیا میں تصرف کرنا نہیں ہے، بلکہ رزق کے حصول و صرف میں ہماری رضا اور ہمارے قانون کو پوری طرح ملحوظ رکھنا ہے۔ ہم نے تم کو جو ذرائع و وسائل اور حصۂ دولت دیا ہے اس کے ذریعے ہم تمہاری آزمائش کرنا چاہتے ہیں کہ تم کیا رویہ اختیار کرتے ہو۔ یہ حصۂ دولت اور یہ ذرائع و وسائل خدا کی اطاعت اور نوعِ انسانی کی خدمت میں صرف ہوتے ہیں۔ یا خدا سے بغاوت کرنے اور اس کے بندوں کو محروم سے محروم تر بنانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ زیادہ حصہ پانے والے کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ کم پانے والے کے متعلق اپنی ذمہ داری کو کس حد تک محسوس کرتا ہے۔ اور کم پانے والوں کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ زیادہ پانے کے لئے خدا تعالیٰ کی حدود کو تو نہیں

۳- محاسبہ اور جواب طلبی کے تصور سے امتحان کے تصور کی تکمیل کے لئے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ایک دن زندگی کی ساری سرگرمیوں اور معاشی جدوجہد کے سارے ہنگاموں کا باقاعدہ محاسبہ بھی ہونا ہے اور تفاوت رزق نے جو ذمہ داریاں نوعِ انسانی پر ڈال دی ہیں۔ ان کے بارے میں جواب طلبی بھی ہونی ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ "لَتُسْئَلُنَّ عَنِ النَّعِيمِ"، تم سے ان تمام نعمتوں کے بارے میں باز پرس ہوگی جو تمہیں تفویض کی گئی تھیں کہ ان کا استعمال کن مقاصد کے لئے کیا گیا۔ اور آیا ان کا حق شکر ادا کیا گیا یا نہیں؟

معتقدات کا جوہر | ان سارے معاشیاتی معتقدات کا جوہر ایک آیت میں سمیٹ دیا گیا ہے:-

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّ
زِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ
وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ
نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ
يَكُوْنُ حُطٰمًا ———
——— وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝
سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ
اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔

جان لو کہ (خدا اور آخرت سے بے نیاز) دنیوی زندگی ایک کھیل کود ہے ایک سجاوٹ ہے اور تمہاری آپس کی مفاخرت، (اور) اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ایک جدوجہد ہے جس کا حال اُس کھیتی کا سا ہے جس کی روئیدگی دہقانوں کا دل لبھاتی ہے پھر وہ شباب پر آتی ہے۔ اور تم اسے پک کر زرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اور پھر کسی جائے ناگہانی سے وہ بھس بن کے رہ جاتی ہے ——— اور دوسری طرف، (آخرت) کی زندگی ہے جس (میں کسی کے لئے) عذاب شدید ہوگا اور کسی کے لئے، اللہ کی رضا و مغفرت ہوگی۔ تو پھر دنیا کی زندگی (کی حقیقت) کیا ہے۔ بجز اس کے کہ دھوکے کی ایک ٹٹی ہے۔ لپکو اللہ تعالٰے کی مغفرت اور اس کی اس جنت کی طرف جس کی وسعتیں ایسی ہیں جیسے آسمان و زمین کی پہنائیاں، اور جسے اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ زندگی کا ایک ڈھنگ تو یہ ہے کہ دولت کے کمانے اور معاشی فوقیت کی جدوجہد کرتے ہیں آدمی اپنی نازک ذمہ داریوں سے آنکھیں بند کر کے کھو جائے۔ اس طرز پر جو زندگی کائنات کے مالک و حاکم کے منشا سے آزاد ہو کر اور آخرت کی جواب طلبی سے بے نیاز ہو کر بسر کی جائے گی۔ اس کی حیثیت ایک فصل کی عارضی سرسبزی کی سی ہے جو آخر کار یکایک تباہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور کسان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ زندگی بسر کرنے کا دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ آدمی [illegible] سرگرمیوں میں اپنی نگاہیں آخرت کی عدالت کے محاسبہ پر اور اس کے نتیجے میں ملنے والی دوامی زندگی پر جمائے رکھے۔ اس طرز پر جو زندگی استوار ہو گی اسمیں ساری مسابقت خدا تعالیٰ کی عبادت، اور اخلاقی ارتقا اور نوع انسانی کی سچی خدمات کی انجام دہی میں ہو گی۔ اسلامی معتقدات اسی طرز زندگی کو ابھارنے والے ہیں ظاہر ہے کہ اس طرز زندگی اور سرمایہ دارانہ طریق حیات میں نہایت درجہ کھلا تضاد موجود ہے۔

اسلامی عقاید کی تجدید کی ضرورت یہ اسلامی معتقدات جو انسانوں کے معاشی تعلقات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ مدتوں کی ناسازگاری ماحول کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں ٹھٹھر گئے ہیں۔ ان معتقدات کی نہ آبیاری ہوئی۔ نہ ان کی تربیت کا کوئی تسلی بخش انتظام ہو سکا۔ نہ ان کی حفاظت کے لوازم فراہم کئے گئے۔ چنانچہ ان معتقدات کا چرچا باقی ہے۔ لیکن ان میں اتنی جان نہیں رہی کہ یہ افراد کی عملی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکیں۔ اب اگر پاکستان میں اسلامی نظام معیشت کو استوار کرنا ہو تو یہاں کی حکومت کو سب سے پہلے اسلامی عقائد کی تجدید پر توجہ مرکوز کرنا پڑیگا۔ آج اگر نظام تعلیم، ریڈیو، سینما، لٹریچر اور اخبارات، خطیب اور مقررین، ائمہ مساجد اور سیاسی ورکر ان عقاید کے بحال کرنے کیلئے اور اسلامی نقطۂ نگاہ کے احیاء کے لئے ہمہ تن معروف ہو جائیں تو وہ تین سال کے اندر ہمارے ملک کی اکثریت کی ذہنیتیں اسلامی سانچے میں ڈھل سکتی ہیں۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ اگر ہمارے معاشرہ کے افراد کی ایک بڑی تعداد اسلام کے معاشی معتقدات کو پوری طرح اپنے اندر پیدا کر لے۔ تو یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے جونک بننے کی ذلت اختیار کر سکے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے کاروبار کی "گاڑھی" میں گھوڑے اور گدھے کی طرح جوتنے پر تیار ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی گردن پر "پیر تسمہ پا" بن کر سوار ہو۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ دولت مند مسلمان غریب مسلمانوں کو اپنا لقمہ بنانے کے لئے معاشیات کے سمندر میں ماہی گیری کرتے نظر آئیں

۲- تعمیرِ اخلاق

لیکن اسلام عیسائیت کی طرح صرف چند عقاید قبول کرانے کے لئے سفارش کر کے الگ نہیں ہو جاتا، بلکہ ان کے پورے پورے استحکام کے لئے اور ان کو زندگی میں مؤثر بنانے کے لئے عباداتِ خمسہ کا تربیتی پروگرام اختیار کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے پیش کردہ عقائد پر افراد کی ایک نئی معاشی سیرت تعمیر کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسلام کی تعمیرِ اخلاق کی اس اسکیم کا آپ کے سامنے تعارف کرا دوں جس کے بغیر اسلام کے معاشی نظام کی اٹھان ہو ہی نہیں سکتی۔

زندگی کا اونچا نصب العین | معاشی اخلاق کی تعمیر میں اسلام نے اولیں اہمیت اس چیز کو دی ہے کہ وہ مسلم سوسائٹی کے ایک ایک فرد کے سامنے زندگی کا ایک وسیع اور اونچا نصب العین ایسا رکھتا ہے جو اسے معاشی حیوان کے درجے تک نہ گرنے دے اور اس کا جینا کھانے کیلئے نہ ہو۔ بلکہ کھانا جینے کے لئے اور جینا اعلیٰ تر مقاصد کے لئے ہو۔ قرآن نے ایک مسلم کی اصل ذمہ داری کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم وہ بہترین امت (پارٹی) ہو جسے نوعِ انسانی کی خدمت کے لئے برپا کیا گیا ہے، سو تم بھلائی کا حکم کرنے والے اور برائی کو روکنے والے ہو۔

یہ آیت ہر فردِ مسلم کو زندگی بھر کے لئے ایک ڈیوٹی پر مامور کرتی ہے۔ کہ وہ اپنے زیادہ سے زیادہ وقت اور مال اور قوتوں کو نوعِ انسانی کی صلاح و فلاح کے لئے استعمال کرے۔ اس عالمگیر اور دوامی ذمہ داری کا احساس جن لوگوں میں نشوونما پالیتا ہے۔ ان کے لئے دولت سمیٹنے، سکے گنتے رہنے، اور عیاشی اور تفریحات میں اپنے آپ کو مصروف کر دینے کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ یہ اسی اونچے نصب العین کا فقدان ہے جس نے مغربی اقوام میں سرمایہ داری کو نشوونما دی ہے۔ اور اسی نصب العین کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد ہی ہماری سوسائٹی میں دین سرمایہ داری کو فروغ پانے کا موقع ملا ہے۔ اسلام خدمتِ انسانیت کے مقصدِ اعلیٰ کے لئے ایک ایک مسلم فرد کو ایسا سپاہی بنا دینا چاہتا ہے جو نیکی کی ہر شکل کو غالب کر دینے کے لئے برائی کی ہر شکل سے برسرِ پیکار رہے۔ ان سپاہیوں کو یقیناً اپنی قوتوں کی بحالی کے لئے رزق کی ضرورت ہے۔ لیکن خیر و شر کی جنگ میں عین مورچے

پر آنے کے بعد ان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ اپنی ساری توجہ کھانے پینے کے مسائل پر صرف کر دیں خدا کی نیابت و خلافت کی بھاری ذمہ داری کو محسوس کر لینے کے بعد کسی مسلم کے لئے اس کا موقع کہاں کہ وہ اپنی ساری زندگی کو معدے کے محور پر گھما دے۔ اور ایک جانور کی طرح دن رات چارے اور گھاس کے پیچھے پڑا رہے۔

معاشی جدوجہد میں پابندئ حدود ایک اونچا نصب العین انسان کے سامنے رکھ دینے کے بعد اسلام اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے۔ کہ ضروریات پوری کرنے کے لئے جو جدوجہد کی جائے۔ اس میں اخلاقی حدود کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے۔ اپنے حصے کا رزق حاصل کرنے کے لئے وہ دوسروں کی حق ماری کرنے سے روکتا ہے۔ اور یہ احساس بیدار کرتا ہے۔ کہ کمائی کی ہر کوشش بھلے طریق سے کی جائے قرآن نے انبیا کو اور ان کی معرفت ہر فرد مسلم کو یہ ہدایت دی ہے۔ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا۔ یعنی اپنا رزق طیبات تک محدود رکھو۔ اور عمل صالح پر کاربند رہو۔ اسلام کے پورے معاشی فلسفہ کا جوہر ان چند لفظوں میں سمٹ کیا ہے۔ مدعا یہ ہے۔ کہ حصولِ رزق میں پورا اہتمام اس بات کا ہونا چاہیئے کہ طیبات حاصل ہوں۔ روزی پاکیزہ ہو۔ ذرائع اور وسائل جائز قسم کے ہوں۔ اور ساری معاشی جدوجہد میں "عمل صالح" کی پابندی کی جائے۔ اس آیت کو مدتہائے مدید سے پامال کیا جا رہا ہے اور اس میں جس معاشی اخلاق کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ عملی زندگی سے بے دخل ہو چکا ہے۔ آج رزق اور ذرائع و وسائل طیبات کی جگہ محرمات اور مکروہات پر مشتمل ہیں۔ اور دولت کی ساری قوت عمل صالح کی جگہ منکرات کے فروغ میں صرف ہو رہی ہے اور اسی نامطلوب حالت کے موجود ہونے کا نام سرمایہ داری ہے۔

نبی صلعم نے قرآن کے اسی مدعا کو اَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ کے کلمات میں سمو دیا ہے یعنی حصولِ رزق کی مساعی میں اخلاقی جمال برقرار رہنا چاہیے۔

اصول کفاف کی ترغیب نبی صلعم نے فرمایا کہ:-

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَكَانَ رِزْقُهُ كَفَافًا — فلاح پائی اس نے جو اسلام پر کاربند ہوا اور جس نے رزق کفاف پر قناعت کی۔

پھر آنحضور نے خدا سے یہ دعا کی کہ:-

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ آلَ مُحَمَّدٍ كَفَافًا — اے اللہ! آلِ محمد کو رزق کفاف عطا فرما۔

رزق کفاف سے مراد یہ ہے کہ آدمی کو اتنی روزی حاصل ہو جائے کہ وہ ایک مسلم کی ایمان، اخلاق، اور آبرو سے بھری ہوئی زندگی بسر کرنے کے لئے روزمرہ کی ضروریات کو بخوبی پورا کر سکے۔ اور زائد از ضرورت رزق کو جمع رکھ چھوڑنے سے بے نیاز رہ سکے۔ اوپر فرد کی جو ذمہ داری بیان کی گئی ہے اس کے تقاضے اگر کسی کے پیش نظر ہوں تو وہ رزق کفاف سے زیادہ کمانے کے لئے وقت نکال ہی نہیں سکتا۔ اور نکالے تو عمل صالح کی پابندی کے ساتھ طیبات پر اکتفا کرنے کی صورت میں وہ تجوریوں کو بھرنے کی کوئی مہم لے کے چل ہی نہیں سکتا۔ ایک مسلم فطرۃً مجبور ہے کہ وہ رزق کفاف پر نگاہ جمائے۔ اور معاشی جدوجہد سے جتنا وقت اور جتنی قوتیں بچا سکے وہ خدا کی عظیم تر عبادات کے انجام دینے اور انسانیت کی خدمت میں صرف کر دے۔ لیکن اگر کسی شخص کی قوتیں دولت پیدا کرنے ہی کے لئے خاص ہوں تو اس کے لئے بھی فلاح کا محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے رزق کفاف اپنے لئے رکھ لے اور بقیہ مال کو دوسرے افراد اور معاشرہ اور نظام اسلامی کی خدمت کے لئے صرف کرے۔ اسلامی قانون کا نہ سہی اخلاق کا تقاضا یہی ہے۔

نبی صلعم کے صحابہ کرام کا مسلک یہی تھا کہ وہ حصول رزق پر اول تو توجہ ہی کم سے کم ضروری حد تک دیتے تھے اور اگر اللہ کا فضل "ضروریات" سے زیادہ ہوتا تو، سے اسلام اور مسلمانوں کی ضروریات میں صرف کرنے کے لئے تیار رکھتے تھے۔ اسی اخلاقی مسلک کو حضرت ابوذرؓ نے قانون کی حیثیت دینی چاہی تھی، لیکن حضرت عثمان نے اخلاقی قانون کو عدالتی قانون بنانے سے بجا طور پر انکار کر دیا تھا۔ تاہم حضرت ابوذرؓ جس مسلک کفاف کے داعی تھے وہ بجائے خود ایک اہم اخلاقی اصول ضرور تھا۔ اور یہ اصول ایک مسلم کے پیش نظر رہنا چاہیے۔

اسلام کو خزانے جمع کرنے اور سکوں کی گنتی کرتے رہنے کی ذہنیت ہی سرے سے نامرغوب ہے چنانچہ قرآن نے جا بجا اسے کراہت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایک جگہ کہا کہ:-

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ — غفلت میں مبتلا کر دیا ہے تم کو مال بڑھانے کی جدوجہد نے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا اترو۔

دوسری جگہ زر پرستانہ کردار کو پیش کیا کہ:-

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۨالَّذِيْ جَمَعَ — تباہی ہے ہر اس طعن باز عیب چیں کے لئے جس نے

مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ ○

دولت سمیٹی اور پھر اسے گن گن کر رکھا اور سمجھتا یہ ہے کہ اُس کی دولت ہمیشہ اُس کا ساتھ دے گی !

جس معاشی ذہنیت و کردار کو ان آیات میں مکروہ کر کے دکھایا گیا ہے، اسے ترک کرنے کے بعد لازماً اصولِ کفاف ہی کا اخلاقی مسلک باقی رہ جاتا ہے۔ یہ مسلک اگر کسی سوسائٹی میں رائج ہو تو اس میں معاشی ناہمواری کا برقرار رہنا ناممکن ہے۔

ترغیب انفاق | اصولِ کفاف کے اندر در اصل انفاق کا اصول خود شامل ہے۔ اسلام اپنے زیر اثر لوگوں سے بہت ہی شدت سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ غلبۂ دین کے لئے اسلامی حکومت اور اسلامی سوسائٹی کے لئے اور ضرورتمند افراد کی شخصی امداد کے لئے اپنے مال صرف کریں۔ قرآن کی لرزا دینے والی آیات میں سے آیتِ کنز بھی ایک ہے۔ فرمایا :-

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ

اور جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کر رکھتے ہیں اور اُن کو اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرتے، اُن کو خوشخبری سنا دیجئے عذابِ الیم کی !

چنانچہ یہ خوشخبری ان الفاظ میں سنائی گئی :-

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ

پس سونے چاندی کی تھیلیوں (کو تپا تپا کر اُن) سے اُن کی پیشانیوں اور اُن کے پہلوؤں کو داغا جائے گا۔

پھر اربابِ بخل کے بارے میں فرمایا کہ :-

لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

کنجوسوں کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ اللہ نے ان کو جو مال دے رکھا ہے وہ ان کیلئے مفید ہے، نہیں وہ ان کیلئے مضر ہے قیامت کے دن اُن کی کنجوسی کا سارا حاصل طوق (طوقِ لعنت)

بناکر ان کی گردنوں میں لٹکایا جائے گا۔

یہ وہ آیات ہیں جنہوں نے صحابہ کرام کے دلوں کو جھنجھوڑ دیا تھا اور وہ مضطرب ہو کر یہ معلوم کرتے تھے کہ ان کو اپنے مالوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اور یقیناً ان آیات نے دلوں کو معلوم کرنے کے ایک نظم کا حامل بھی ہونا چاہئے۔

یہ صحیح ہے کہ آیت کنز میں اکتناز کی جو انتہا بیان کی گئی ہے۔ ادائے زکوٰۃ کی صورت میں وہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن یاد رہے کہ صرف زکوٰۃ دینے سے حق انفاق ادا نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ تو ایک قانونی مطالبہ ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے اخلاقی مطالبات بھی ہیں۔ اور ان کو پورا کئے بغیر آدمی کو اپنی عاقبت کے متعلق مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے۔ نبی صلعم کی تصریح ہے کہ۔

ان فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ — زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں [illegible] کے حقوق ہیں۔

ان حقوق کی ادائی کے طریقے کو ایک دوسری حدیث واضح کرتی ہے۔ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے۔ کہ نبی صلعم ایک مرتبہ دیوار حرم کے سائے میں تشریف رکھتے تھے۔ اور بیٹھے بیٹھے آپ نے فرمایا۔

"ھم الاخسرون" وہ لوگ سخت خسارے میں ہیں۔ سخت خسارے میں ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا کون یا رسول اللہ؟ فرمایا جو لوگ زیادہ دولت کے انبار جمع کر رکھتے ہیں۔ مگر پھر اس کو آپ نے اپنے ہاتھوں سے چاروں طرف پھینکنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑے فرمایا لیکن [illegible] خرچ نہیں کرتے۔ یہ ہے "حقاً سوی الزکوٰۃ" کی حقیقت۔ یہی دولت زکوٰۃ دینے کے بعد فارغ نہیں ہو جاتی۔ اگر اسلامی نظام حکومت، اسلامی سوسائٹی اور افراد مسلم کی بے شمار ضروریات ان سے ہر وقت مطالبہ کرتی ہیں۔ "ان تقرضوا اللہ قرضاً حسناً"!

احادیث تو یہاں تک بتاتی ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کہے گا میں جب خود ضرورت مند بن کر تمہارے پاس پہنچا تو تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ بندے تعجب سے پوچھیں گے کہ اے اللہ تو کیسے ضرورت مند ہو سکتا ہے؟ خدا فرمائے گا کہ [illegible] میرا فلاں بندہ ضرورت مند ہو کر [illegible] تم نے اس سے [illegible] اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی حکومت، سوسائٹی اور افراد مسلم کی ضروریات [illegible] بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی [illegible] ہے۔ اور ان مطالبات کے جواب میں زکوٰۃ دے دینا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا۔

انفاقِ "العفو" انفاق کے مطالبات کی وسعت کے پیش نظر صحابہ کی سوسائٹی میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا خرچ کیا جائے۔ اور کتنا خرچ کیا جائے، اسی سوال کو قرآن نے دوہرایا کہ "یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ" لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ "قُلِ العفو" (جواب میں کہہ دیجیے "کہ العفو") العفو بچتوں اور فاضلات کو کہتے ہیں۔ اور انفاق العفو۔ سے مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد کی بچتوں اور فاضلات کو خدا کی راہ میں اس وقت تک صرف کرنا چاہیے۔ جب تک کہ ان کے مصرف موجود ہوں۔

یہ چیز مسلم ذہنیت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ کہ اسلامی حکومت کا خزانہ دم توڑ رہا ہو۔ یا سوسائٹی کی ضروریات اٹکی ہوئی ہوں، یا مسلمان بیوائیں اور یتیم بچے، اور مزدور پیشہ مساکین فاقہ اور بیماری میں مبتلا ہوں۔ اور دوسری طرف روپیہ بچا بچا کے رکھا جا رہا ہو یہی وہ بخل ہے جس کے طوق گلو جنے کی وعید سنائی گئی ہے۔

پھر "العفو" کا دائرہ روپے پیسے غلے اور استعمالی اشیا ہی تک وسیع نہیں ہے، بلکہ اگر کسی شخص کے پاس وقت فاضل ہے۔ دماغی یا جسمانی قوت فاضل ہے۔ تو اسکو اسی کا انفاق کرنا چاہیے چنانچہ نبی صلعم نے فرمایا۔ کہ صدقہ ہر مسلم پر واجب ہے۔ (مسلم و بخاری) پوچھا گیا۔ کہ اگر کسی کے پاس کچھ مال ہی نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ فرمایا۔ ہاتھ سے محنت کر کے اپنے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ پھر سوال ہوا۔ کہ اگر وہ محنت کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر فرمایا محتاج، اور مظلوم کی ممکن امداد کرے۔ پوچھا گیا۔ کہ اگر یہ بات بھی استطاعت سے باہر ہو تو فرمایا۔ نیکی کی نصیحت ہی کرتا رہے۔ پھر پوچھا گیا۔ کہ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو؟ فرمایا۔ دوسروں کو شر پہنچانے سے باز رہے۔ تو یہ بھی ایک طرح کا صدقہ ہے ---- یہاں تک کہ نبی صلعم نے صدقہ کی اصطلاح کو اتنی وسعت دی ہے۔ کہ راستے سے کانٹا ہٹا دینا صدقہ ہے۔ کسی کا بوجھ اٹھوا دینا صدقہ ہے، راستہ بتانا صدقہ ہے۔ صلح کرانا صدقہ ہے۔ مسلمان سے خندہ روئی سے پیش آنا صدقہ ہے۔ مدعا یہ کہ مال وقت اور قوت میں سے جو کچھ بھی "العفو" کی تعریف میں آجائے، اس میں سے جو رقم بھی خدا کی خوشنودی کے لیے بندوں کی خدمت میں صرف کی جائے گی۔ وہ صدقہ ہو گی ——— اور صدقہ اسی وسیع تصور کے ساتھ ہر مسلمان کے لیے لازم کیا گیا ہے۔

صدقہ کی وسعت کا تصور دلانے کے لیے ایک اور حدیث کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے ترمذی کے علاوہ صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں لیا گیا ہے روایت یوں ہے کہ ایک اعرابی نے آنحضور صلعم سے

سوال کیا کہ مجھے ہجرت کا مسئلہ بتائیے۔ آپ نے فرمایا تیرا بھلا ہو وہ تو بہت دشوار کام ہے یہ بتا کیا تیرے پاس کوئی اونٹ ہے؟ اعرابی نے عرض کیا جی ہاں اونٹ تو ہیں فرمایا کیا تو ان میں سے صدقہ زکوٰۃ دیتا ہے؟ اس نے عرض کیا جی دیتا ہوں پھر پوچھا کیا ان میں سے دودھ پینے کے لئے کسی کو عاریۃً کوئی اونٹنی کبھی دیتے ہو؟ وہ بولا جی ہاں دیتا ہوں پھر دریافت فرمایا کہ کیا گھاٹ پر جانے کے دن مسکینوں کو دودھ بانٹتا ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا یہی طرز عمل جاری رکھ۔ خدا تعالیٰ تیرے عمل صالح میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہونے دے گا۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے۔ کہ صرف صدقہ زکوٰۃ کی ادائی ہی کا مطالبہ نہیں، بلکہ اپنے اموال اور ذرائع و وسائل کے ذریعے ہر طرح کی خدمات عامہ انجام دیتے رہنا مطلوب ہے جیسا نبیؐ نے امت سے یہ چاہا کہ:۔

لَا تَمْنَعُوا فَضْلَ الْمَاءِ لِتَمْنَعُوا بِهِ الْكَلَأَ۔ — فالتو پانی کو نہ روکو، کیونکہ اس طرح تم نباتات کی روئیدگی کو روک سکتے ہو۔

وہ یہ کیسے پسند کر سکتا ہے۔ کہ دولت ذرائع و وسائل اور قوائے کارکردگی میں سے "العفو" کو روک کر رکھا جائے۔ اور اس طرح آدمی سوسائٹی کی ضروریات کے پورا ہونے میں رکاوٹ پیدا کرے۔

ماعون دینا صدقہ کی ایک قسم گھریلو استعمال کے آلات مثلاً ترازو، باٹ، چھلنی چھاج، کلہاڑی، کدال وغیرہ کو مستعار دینا ہے۔ انہیں چیزوں کو "ماعون" کہا گیا ہے۔ اور ان کے بارے میں بخل کرنے کو سورۂ ماعون میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

اسلامی اخلاقیات اور سرمایہ داری اب آپ خود غور کیجئے۔ کہ اگر کسی آبادی کے اکثر افراد میں یہ اسلامی اخلاق پایا جاتا ہو کہ، وہ دولت پرستی کے بجائے ایک اونچے اخلاقی نصب العین کے لئے ہمہ تن وقف ہوں۔ ان کی نگاہیں قدر کفاف پر مرکوز ہوں، وہ دونوں ہاتھوں سے انفاق کرتے ہوں وہ "العفو" کو دوسروں کی اجتماعی اور انفرادی ضروریات میں صرف کرتے ہوں، وہ باہم "ماعون" دیتے ہوں، وہ کاروبار میں اخلاقی حدود کے پابند ہوں تو یہ بات کس طرح ممکن ہے۔ کہ ان میں سرمایہ داری فروغ پائے؟

کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ اسلامی اخلاقیات آج کہاں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ جب اسلامی سوسائٹی کا نظم ہی کئی صدیوں سے درہم برہم چلا آ رہا ہے۔ اور سرے سے عقائد اور عبادت اساسی ہی برقرار نہیں رہے

تو ان عقائد و عبادات پر استوار ہونے والے اخلاقیات کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جو سیلاب پورے اسلامی نظام کو بہالے گیا ہے، اس کی موجیں اسلام کے اخلاقی تقاضوں کو بھی بہالے گئی ہیں۔ پس آج اگر عقائد و عبادات کو بحال کرنے کے لئے کوئی مہم شروع کی جانی چاہئے تو یقیناً اسلام کے ان اخلاقی تقاضوں کو زندہ کرنے کے لئے بھی ایک تحریک برپا ہونی چاہئے۔ لیکن یہ امر بڑا باعث حیرت ہے کہ اسلامی اخلاق کے افسانے تو کہے جا سکتے ہیں، لیکن اس کو قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ مایوسی کا یہ پہلو [illegible] ہوشیار طبقے نے پیدا کیا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر حکومت، سوسائٹی، جمہوریت کے نظام کا مطلوبہ اخلاق پیدا کرنے کے پروگرام بنا سکتی ہے۔ اگر تعلیم اور نشر و اشاعت کے ذرائع سے دیگر [illegible] اخلاقیات کو فروغ دے سکتے ہیں تو خاص اسلام ہی کے اخلاقیات کی بحالی کے لئے وہ کیوں بیکار ہیں؟ یا تو یہ کہئے کہ کسی طرح کا اخلاق بھی تبلیغ، تعلیم اور تربیت کے ذریعے انسانوں میں پیدا نہیں کیا جا سکتا، اور یا پھر تسلیم کیجئے کہ اگر کوئی غیر اسلامی اخلاق پیدا کیا جا سکتا ہے تو اسلامی اخلاق بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلام کے حق میں ایک طرفہ مایوسی کیوں؟ جبکہ اخلاق تو اسلام ہی ہے کہ ان پڑھ بدوؤں میں پیدا کر کے دکھا چکا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ آج کے ذہین اور تعلیم یافتہ انسانوں میں پیدا نہ کر سکے جب کہ آج اس سے اعلیٰ سے اعلیٰ ذرائع و وسائل میسر آ سکتے ہیں۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ایک صالح قیادت بر سر عمل ہو اور وہ حکومت کی زمام کار ہاتھ میں لینے کے بعد [illegible] کی اسلامی قوتوں کو رضائے الٰہی کے مطابق استعمال کرنے کا آغاز کر دے۔

۳۔ صالح معاشرہ کی تشکیل

اسلام افراد میں اخلاق کی تعمیر کرنے کے بعد ان کو حالت انتشار میں نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ وہ ان اینٹوں کو جوڑ کر معاشرہ کا ایک ایسا قلعہ تعمیر کرتا ہے جس میں کسی معاشی فساد کے لئے داخل ہونا آسان نہ ہو۔ اور جس کی فضا میں معاشی امن پوری طرح نشو و نما پا سکے۔ انفرادی اخلاق یقیناً ایک قابل قدر نعمت ہے، لیکن اگر اس اخلاق کے تقاضوں کے مطابق معاشرہ کا ماحول تشکیل نہ پائے، تو انفرادی اخلاق آہستہ آہستہ سوکھ جاتا ہے۔ اسلامی نظام حیات کے تحت جہاں افراد میں ایک خاص طرز کی سیرت پیدا ہو جاتی ہے، وہاں اسی سیرت کے مطابق ایک صالح سوسائٹی بھی وجود میں لائی جاتی ہے۔ صالح معاشی کی فضا میں افراد کی سیرت کے جوہر پوری طرح کھلتے ہیں، اور اسی مناسبت سے کھلتے ہیں جس

تناسب سے کہ معاشرے کی اجتماعی فضا کو اسلام [illegible] کر خوشگوار بنا دیا گیا ہو۔

معاشی تحفظ اور ترتیب: اسلام اپنے اصولوں پر بنے ہوئے معاشرے میں افراد کے درمیان باہمی وابستگی اور ترتیب و محبت پیدا کرتا ہے۔ [illegible] تعاون [illegible] ایک دوسرے کی مدد کرے۔ ایسے ہوں۔ سرمایہ دارانہ [illegible] معاشیات کے تحت ہر فرد باقی دوسروں سے کچھ لینے کو اپنا کمال سمجھتا ہے اور اپنی کمائی میں اپنی خواہشات کے حقوق لے [illegible] دوسروں کے حقوق کا احساس نہیں رکھتا بخلاف اس کے اسلام اپنے معاشرے میں یہ چاہتا ہے کہ دوسروں سے کوئی بھی نہ جائے بلکہ دوسروں پر خرچ بھی کیا جائے۔ دوسروں [illegible] نہیں [illegible] پہنچایا بھی جائے۔ اور اسلام اپنے معاشرے کے ہر فرد کو دوسرے افراد کے حقوق کا احساس دلاتا ہے۔ ایک مسلم اپنی خود [illegible] نفس ہی کا ذمہ دار نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ مختلف قسم کے تعلقات رکھنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے متعلق بھی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔

یہ احساس حقوق اور شعور ذمہ داری، اسلام اپنے معاشرے کے ہر فرد میں بیدار کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے ذریعے تعاون و اخوت کی ایسی فضا تشکیل پاتی ہے جس میں طبقاتی تقسیم اور طبقاتی کشمکش اور طبقاتی تصادم کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

یہاں ان حقوق کی چند اصولی اقسام بیان کی جاتی ہیں، جو اسلامی معاشرے کے تحت ہر فرد مسلم کے پیش نظر رہتے ہیں۔

حقوق نفس: حقوق کی تقسیم کا سوال [illegible] سب سے پہلے ایک فرد کی اپنی ہستی سامنے آتی ہے چنانچہ نبی صلعم فرماتے ہیں کہ: ان لنفسک علیک حقا[1] یعنی انسان کے اوپر خود اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ان حقوق سے اسلام نے رہبانیت کی طرح روگردانی نہیں کی بلکہ ان کو تسلیم کیا ہے۔ اور ان کے لئے اپنے نظام فکر و عمل میں باقاعدہ جگہ نکالی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ جب تک انسان اپنے نفس کے حقوق کانٹے کے تول پورے نہیں کرتا، وہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیتا رہتا ہے۔

ایک فرد مسلم کو بہر حال اپنی زندگی کے [illegible] معاشی [illegible] زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے یہ پتا لگتا ہے کہ وہ محنت کے [illegible] اپنے نفس [illegible] معاشی [illegible]

[1] [illegible] ان لنفسک علیک حقا

بھی کرے، وہ اپنی بود و ماند ایسی رکھے، کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کا شکر آمیز اظہار ہو، لیکن دو مفاسد سے پرہیز لازم ہے، ایک یہ کہ نفس کے تقاضوں کو اسراف کی حد تک نہ پہنچنے دے۔ دوسرے یہ کہ نفس کو کبر کے مظاہر کا حق نہ دے۔ ورنہ یہ دونوں مفاسد اس کی سیرت کو اسلام کی بنیادوں سے ہٹا کر رہیں گے۔ اور ان کا نتیجہ آخرت میں بہر حال دوزخ ہے۔

حقوق والدین | ایک فردِ مسلم کے لئے اپنے نفس سے باہر کی دنیا میں اسلام نے حقوق کا سب سے زیادہ بڑا بوجھ اگر کسی کا بتایا ہے تو وہ والدین کے حقوق کا بوجھ ہے۔ سوال ادب و اطاعت ہی کے انتہائی اہتمام کا نہیں بلکہ معاشی طور پر بھی والدین کی پوری پوری خدمت انجام دینے کی ذمہ داری اولاد پر عاید ہوتی ہے۔ دنیا کا یہ وہ اہم ترین رشتہ ہے جس کے حقوق کو پہنچاننے کے لیے انسانی زندگی کے سارے حقوق کا شعور ہوتا ہے۔ ماں باپ کی شفقت اور ماں کی محبت کی قدر اگر کسی کے دل میں پیدا نہ ہو سکے۔ تو پھر نہ وہ خدا تعالیٰ کی بخششوں کا قدر دان ہو سکتا ہے؛ نہ دوسرے ابنائے نوع کے حقوق کا اسے کوئی احساس ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے حقوق کے بعد مخلوق میں سے اسلام نے والدین کے حق کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے اسلام نے اخلاقی حد تک ہی نہیں، بلکہ قانونی طور پر بھی والدین کو اولاد اور ان کے سارے اموال و املاک کا مالک ٹھہرایا ہے۔ انہیں حق دیا ہے۔ کہ اولاد کے اموال میں جو تصرف چاہیں کریں۔

حقوق اہل و عیال | حقوق والدین کے بعد دوسرا درجہ اہل و عیال کے حقوق کا ہے۔ بیوی بچوں کا نان و نفقہ یعنی ان کی معاشی ضروریات کا پورا کرنا اسلام کے قانون کی رو سے واجب ہے ہی۔ لیکن اگر یہ حق خدا تعالیٰ کی رضا کیلئے اور اس کی ہدایت کے مطابق ادا کیا جائے تو ہر وہ کوڑی عند اللہ صدقہ شمار ہوتی ہے جو کسی شخص نے اپنے اہل و عیال و خرچ کی ہو سے پہنے۔ اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لئے جائز ذرائع سے جو کوشش کی جائے۔ وہ قطعی طور پر عبادت کی تعریف میں داخل ہے۔ پھر اسلام نے اپنی روح مساوات کو قائم رکھنے کے لئے یہ چاہا ہے کہ ایک مسلم اپنے اہل و عیال پر اپنی آمدنی کے مطابق صرف کرے اور بیوی بچوں کو وہی کچھ کھلائے اور پہنائے جو کچھ کہ وہ کھاتا پہنتا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر سفارش یہاں تک کی گئی ہے۔ کہ ایک آدمی اپنے متعدد بچوں پر مال صرف کرنے میں تفریق نہ کرے۔ ورنہ ان میں اخلاقی مفاسد پیدا ہوں گے۔

حقوق اہل وعیال کے بارے میں احادیث سے یہاں تک اشارات ملتے ہیں مگر اپنے زیر کفالت افراد کی حقیقی ضروریات کو نظر انداز کر کے جو انفاق باہر کیا جاتا ہے اس میں اہل وعیال کی حق ماری پائی جاتی ہے چنانچہ نبی صلعم نے متعدد مواقع پر اپنے زیر تربیت صحابیوں کو یہ تلقین فرمائی کہ جاؤ اور اپنے اہل وعیال پر مال صرف کرو۔ تمہارے لئے صدقہ یہی ہے اور تمہارے انفاق کے اولیں مستحق تمہارے بیوی بچے ہیں۔ بیوی بچوں کو خستہ حال چھوڑ کر اگر کوئی شخص روپیہ جمع کرتا ہے۔ یا اپنی ذاتی دلچسپیوں پر بے تحاشا اپنی کمائی صرف کرتا ہے۔ اور اپنی خوش پوشی اور خوش حالی کا اظہار کرتا پھرتا ہے۔ یا گھر والوں کو بھوکا چھوڑ کر باہر داد و دہش کر رہا ہے۔ تو اس کی روش اسلام کے تقاضوں کے مطابق بہر حال نہیں ہے۔

حقوق ذوی القربیٰ: والدین اور اہل وعیال کے بعد قرآن اور حدیث دونوں میں ذوالقربیٰ کے حقوق کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ ایک مسلم ان سے چشم پوشی کر کے اپنی عاقبت کے متعلق کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ قرابت داروں کا یہ شرعی حق ہے کہ ایک طرف مسلمان ان کے ایمان و اخلاق کے نشوونما کے لئے جو کچھ کر سکتا ہو۔ کرے اور دوسری طرف وہ معاشی پہلو سے جس حد تک امداد کے محتاج ہوں، اُن کو امداد بہم پہنچائے۔

نبی صلعم کے لئے خمس و فئے کا جو حصہ اسلامی اسٹیٹ کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا اس کے ساتھ آپ کے ذوی القربیٰ کا حق بھی شامل کیا تھا چنانچہ نبی صلعم نے اس حق کو عمر بھر اس طرح ادا کیا۔ کہ بالفاظ کتاب الخراج آنحضور اسی مال سے بنو ہاشم کے کنواروں کی شادیاں کرتے تھے، مقروضوں کے قرض ادا کرتے تھے۔ اور فقراء کو بقدر ضرورت عطا کرتے تھے۔ آپ کے اسوہ کے مطابق آپ کے ہر امتی کے لئے لازم ہے۔ کہ اس کی آمدنی جہاں تک کفایت کرے، اپنے رشتہ داروں کی معاشی ضروریات میں ان کا معاون ثابت ہو۔

اگر کسی سوسائٹی میں حقوق ذوی القربیٰ کا احترام پایا جاتا ہو تو ظاہر ہے کہ ایک ضرورت مند شخص کو اپنے رشتہ داروں کے وسیع حلقے میں سے کسی نہ کسی طرف سے مشکل وقت میں امداد بہم پہنچ سکتی ہے۔

حق الجار: ذوی القربیٰ کے بعد پڑوسی کے حقوق پر زور دیا گیا ہے۔ انجیل میں دین کے تصور کو ان الفاظ میں سمیٹا گیا ہے۔ کہ تو اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور ساری جان کے ساتھ محبت رکھ اور اپنے پڑوسی

کی خدمت کرو" یہ جملہ حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کا جو تصور دلاتا ہے اس میں پڑوسی کے حق کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ احادیث میں ہر مسلمان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے جان و مال اور آبرو کا پورا پورا محافظ ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ترغیب دی گئی ہے کہ اگر گھر میں کوئی نعمت آئے تو اس کا ایک حصہ پڑوسی کے بچوں کے لئے بھی بھیجا جائے۔ سالن پکے تو پڑوسی کو ہدیہ کرنے کے لئے اس میں گنجائش رکھنی چاہئے۔ پھر ایک حدیث ہم کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ اس شخص کا ایمان مشتبہ ہے جس نے خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھالیا لیکن اس کا پڑوسی فاقہ میں مبتلا رہا۔

پڑوس کا یہ معاشی حق اصلاً تو دیوار بہ دیوار کے ہمسایوں کے لئے مخصوص ہے لیکن اس سے محلے اور شہر اور ملک کے ضرورتمندوں کی خدمت کی ذمہ داری کا اشارہ از خود اخذ ہوتا ہے پھر پڑوس سکونت ہی کا نہیں کاروباری قرابت کا پڑوس بھی ہوتا ہے۔ ایک بازار کے دو دکاندار ایک دفتر کے ملازم ایک کارخانے کے کارندے ایک گاؤں کے زمیندار اور دہقان باہم پڑوس کا حق بدرجہ اولیٰ رکھتے ہیں۔

یہ حق الجار جس کا شعور و احساس مر جانے کی وجہ سے سرمایہ داری کو نشوونما پانے میں سہولت حاصل ہو گئی ہے اس کو اگر تعمیر معاشرہ میں پوری طرح اہمیت دی جائے۔ تو موجودہ ناہمواریوں پر کاری ضرب پڑ سکتی ہے۔

حقوق عامۃ المسلمین: یہ تو خاص قسم کے حقوق ہے جن کے تقاضے بہت وسیع ہیں اسلامی معاشرہ میں ایک عام مسلمان کے دوسرے مسلمانوں پر جو حقوق واجب کئے گئے ہیں۔ اگر صرف انہیں کو لے کے دیکھا جائے تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ان حقوق کے احترام کے ساتھ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے طور طریقے بحال رہ سکتے ہیں ایک مسلم کے دوسرے مسلمانوں پر کم سے کم یہ حقوق ہیں:۔

(۱) اس کی جان، مال آبرو کی حفاظت کی جائے۔ (۲) جب ملے اس پر سلام بھیج کر اسکی سلامتی کی دعا کی جائے (۳) اس سے برابر کا برتاؤ کیا جائے (۴) ہمیشہ اس کی بھلائی چاہی جائے (۵) اس کو معروف کی نصیحت کی جائے اور اسے منکر سے روکا جائے (۶) جب چھینک آئے تو اس کے لئے خدا سے رحم کی دعا کی جائے (۷) بیمار ہو جائے۔ تو اس کی عیادت کی جائے (۸) اسکے جنازے کے ساتھ شرکت کی جائے اور اسکے لئے مغفرت کی دعا کی جائے (۹) اس کے ہاں موت فوت ہو جائے تو تعزیت کی جائے (۱۰) اسے تحفہ اور ہدیہ دیا جائے (۱۱)

وہ دعوت دے۔ تو خوشی سے قبول کی جائے (۱۲) وہ گھر آئے۔ تو اسے برابر کی نشست پر بٹھایا جائے۔ (۱۳) وہ کھانے کے وقت حاضر ہو تو اسے دسترخوان پر دعوت دی جائے (۱۴) وہ مہمان یا مسافر ہو تو کم سے کم تین دن تک اس کی پوری تواضع کی جائے۔ (۱۵) وہ مشورہ طلب کرے۔ تو اسے نیک مشورہ دیا جائے (۱۶) وہ سائل بن کر آئے۔ تو اس کی ضرورت پوری کر دی جائے۔ ورنہ نرمی سے معذرت کی جائے۔ (۱۷) وہ قرض کا طالب ہو تو اسے قرض حسنہ دیا جائے (۱۸) وہ کسی چیز کا سودا کر رہا ہو تو اس میں مداخلت نہ کی جائے۔ (۱۹) وہ کسی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے تو اس کے مقابلے پر نکاح کا پیغام نہ بھیجا جائے (۲۰) اس کے خلاف بدگمانی نہ کی جائے۔ بلکہ حسن ظن سے کام لیا جائے۔ (۲۱) اس کی غیبت نہ کی جائے۔ (۲۲) جہاں تک ہو سکے اس کی غلطیوں کو معاف کیا جائے۔ (۲۳) وہ ظالم ہو تو اسے ظلم سے روکا جائے اور مظلوم ہو تو اسے ظلم سے بچایا جائے۔ (۲۴) وہ کسی سے رنجیدہ ہو تو مصالحت کرا دی جائے (۲۵) اس سے تین روز سے زیادہ مدت تک قطع تعلق نہ کیا جائے۔ وغیرہ!

ان سارے حقوق کو سامنے رکھ کر سوچیے۔ اور غور کیجیے کہ یہ حقوق اگر کسی سوسائٹی میں ادا کیے جاتے ہوں تو کیا وہاں یہ ممکن ہے کہ گروہ بندیاں اور طبقہ بندیاں پیدا ہوں اور ایک طرف سے اکڑ اور کبر و غرور پیدا ہو جائے اور دوسری طرف سے بندگی اور غلامی کا مظاہرہ کرنے پر لوگ مجبور ہوں یا کیا یہ ممکن ہے کہ [illegible] کی کیفیت نمودار ہو؟ ہماری موجودہ سوسائٹی تیزی سے سرمایہ دارانہ نظام کی طبقہ بندیوں کی طرف اسی لئے بڑھ رہی ہے کہ اس میں حقوق مسلمہ کا وہ احترام باقی نہیں رہا جو ایک نظام اخوت و مساوات پیدا کرتا ہے۔ اور معاشی ناہمواریوں کو ناقابل برداشت حالت تک پہنچنے نہیں دیتا۔ آج اگر ہمارے کارخانوں کے مالک اور زمیندار لوگوں میں ادائے فرض کا احساس بیدار ہو جائے اور وہ اپنے اجیروں کے سچے خیر اندیش، ان پر شفقت کرنے والے، ان کی مصیبتوں میں حصہ لینے والے، ان کی خبرگیری کرنے والے، ان کو ان کا پورا پورا حق دینے والے بن جائیں تو سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی ناہمواریوں کے اثرات بلا تاخیر کم ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں کسان اور مزدور کی صرف اجرت ہی نہیں ادا کی جا رہی بلکہ اس کے وہ مجلسی حقوق بھی ادا نہیں کیے جا رہے ہیں جو اسلام نے اسے دیے تھے۔ اور اس وجہ سے صورت حالات ناگوار ہو گئی ہے۔

فاقہ صرف مزدوری ہی کو درپیش نہیں بلکہ عزت و وقار کا فاقہ بھی درپیش ہے۔ اور ہمارے [illegible]

کے بھوکے نہیں رہ گئے بلکہ دل و دماغ اور روح کے بھی بھوکے ہیں۔ یہاں قحط صرف سکوں ہی کا درپیش نہیں ہے بلکہ اخوت و مساوات کے منابع کا بھی کال ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے کہ یہ امرا اور غربا میں معاشی ہی نہیں، قلبی اور اخلاقی دوری بھی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نظام کے تقاضوں نے زندگی کی اجتماعی صف بندیوں سے ان کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ زندگی کے کسی گوشے میں امیر اور غریب کا شانہ سے شانہ ملا کر کھڑے ہونا ممکن نہیں رہا۔ دونوں طبقوں کی مجلسیں الگ ہو چکی ہیں، دونوں کی تہذیبیں الگ ہو چکی ہیں، دونوں کے محلے الگ ہو گئے ہیں، نمازوں میں دونوں کی نشستیں جدا جدا ہیں، اور قبرستانوں تک میں دونوں کی قبروں کا نقشہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ اخوت اسلامی جس کے بارے میں نبی صلعم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان جتاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اسلام کا یہ ایسا اعجاز ہے کہ اگر تم اسے پیدا کرنے کے لئے دولت کے انبار بھی صرف کر دیتے تو کامیاب نہ ہو سکتے۔ اس کا پوری طرح تیا پانچہ ہو چکا ہے۔ اس اخوت کو بحال کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ دونوں طبقوں کی جداگانہ مورچہ بندیاں قائم کر کے معرکہ پیکار گرم کیا جائے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سوسائٹی کو ازسرنو اسلام کی بنیادوں پر دوبارہ استوار کیا جائے۔ حقیقی مسئلہ کا اہتمام دونوں طبقات کے افراد کو ازسرنو ایک صف میں لا کھڑا کرے گا۔

وہ اسلامی سوسائٹی جس کے ہر ایک ضرورت مند فرد کے بارے میں سب سے پہلے اس کے ذوی القربیٰ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہو، پھر اس کے پڑوسیوں کو اس کی خدمت کے لئے مامور کیا گیا ہو، پھر اسلامی جماعت کے ہر رکن سے اس کی اعانت کا مطالبہ کیا گیا ہو، کیسے ممکن ہے کہ اس میں معاشی احتیاجیں موجود رہیں اور کوئی ان کی خبر گیری نہ کرے۔

ایک ایسا اعتراض کیا جائیگا کہ ایسے صالح معاشرہ کا خواب کیسے تعبیر پذیر ہو سکتا ہے۔ اور اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ امرا اپنے فرائض کو ادا کریں گے۔ اس کے جواب میں میں یہ عرض کرونگا کہ اسلامی سوسائٹی بنانے کے لئے اگر دس سال تک اس کے افراد میں اسلامی عقاید کی آبیاری کی جائے۔ اسلامی عبادات کو ازسرنو قائم کر کے انہیں اسلام کے معاشی اخلاق کی تربیت دی جائے۔ پھر حکومت پورے دس سال کے دوران اہل ثروت میں ذوق انفاق، پڑوسی کی اعانت، مسلمین کے حقوق کا احترام پیدا کرنے کی جد و جہد کرے۔ یہاں تک کہ ہمارے معاشرتی ماحول میں نئی روایات پیدا ہو جائیں۔ اور ایک ایسے نظام اسلام کے اخلاقی تقاضوں کی حفاظت ...

لئے پیدا ہو جائے۔ تو بہرحال یہ ناممکن ہے کہ موجودہ تفریق و تقسیم برقرار رہ سکے۔ اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے مطالبات کو پورا نہ کرنے والے خوش حال لوگوں کے خلاف جو صرف اپنی انفرادی لذات کے پیچھے پڑے ہیں، ایک جذبۂ نفرت کو بیدار کیا جائے۔ اور ایسے لوگوں کے لئے حکومت اور سوسائٹی کے مختلف میدانوں میں ترقی کرنے کے راستے بند کر دیئے جائیں۔ دولت معیارِ عزت نہ رہے بلکہ فرض شناسی اور اخلاق معیارِ عزت ہو۔ سوال یہ ہے کہ جیسے آج تنگ گانیں بکنے والے ایک نظرباز اور ایک فقرے کسنے والے کے لئے اگرچہ کوئی قانونِ فوجداری مزاحم نہیں ہے، لیکن بہرحال کسی مہذب سوسائٹی کے افراد ایسے لوگوں سے دوستی اور مجلس آرائی رکھنے سے اجتناب کرتے ہیں، ان کے پڑوسی بننے سے بچنا چاہتے ہیں، اور ان کے اثرات سے اپنے بچوں کو بچانا چاہتے ہیں، اور کسی کارِ خیر کے لئے ان کو منتخب کرنے پر تیار نہیں ہوتے، اور اس طرح انسانیت کے ایک گھناؤنے نمونے کو پنپنے سے روک سکتے ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ اسی طرح ہم ایسے امراء کے طرزِ عمل کو نشوونما پانے سے نہ روک دیں جو اسلامی سوسائٹی کے اعلیٰ اخلاقی مطالبات سے غافل ہو کر محض اپنی دولت میں مگن رہنا چاہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف تو صرف رائے عامہ ہی ایک تازیانے کا کام دے گی، بلکہ اسلامی نظامِ تعلیم خود ان کے بچوں کو ان کے طرزِ عمل کے خلاف معترض آرا کرے گا۔ بہرحال ایک سوسائٹی اگر اسلامی اخلاق کے تقاضوں کی حمایت پر تل جائے تو اس کی فضا میں ان تقاضوں سے تغافل کرنے والوں کے لئے جینا محال ہو جاتا ہے۔ موجودہ نسل کے کچھ امراء اگر اپنی عادات بدلنے کے لئے [illegible] پوری طرح آمادہ نہ بھی ہو سکیں تو بھی [illegible] آئندہ نسل کو نئے فتنے پر تیار کیا جا سکتا ہے۔

خود دورِ نبوی میں جب منافقین موجود تھے جو اسلامی معاشرہ کے اخلاقی تقاضوں سے ہمیشہ گریزاں رہتے تھے، باہم ساز باز کرنا، خفیہ مشورے کرنا، اسلامی حکومت کی کارروائیوں کا مضحکہ اڑانا، [illegible] فتنہ کر دینا، دشمن کو راز پہنچا دینا، مسلمانوں میں منافرت [illegible] پیدا کرتے رہنا، ان کے عام مشاغل تھے۔ ان منافقین کو [illegible] بلکہ صرف [illegible] استعمال کیا گیا چنانچہ ان کے لئے مسلم سوسائٹی میں کوئی عزت نہ تھی۔ [illegible] کبھی اجتماعی ذمہ داریوں اور عہدوں کے لئے منتخب نہ کئے [illegible] کچھ امراء اسی طرح اسلامی اخلاق کو قبول [illegible] کریں تو ان کے لئے مسلم سوسائٹی میں عزت کا کوئی مقام نہ رہنا [illegible]

چاہے وہ کتنے ہی بڑے خزانوں کے سانپ بنے بیٹھے ہوں۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ کوئی اصلاحی اسکیم محض قانون کے دباؤ سے کامیاب نہیں ہو سکتی، لہذا اسلام جو قانونی نظام نافذ کرنا چاہتا ہے، اس کے قیام اور نفاذ اور استحکام کے لئے بھی یہ ناگزیر ہے کہ اس کی فطرت کے مطابق ایک معاشرہ تعمیر ہو، اس معاشرہ میں بالعموم رضاکارانہ طور پر اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے کا رجحان موجود ہونا چاہیئے۔ پھر جو چند سرکش افراد ان تقاضوں سے انحراف کرنا چاہیں، ان سے بالجبر دوسروں کے وہ کم سے کم حقوق وصول کر لئے جائیں، اور ان کم سے کم ذمہ داریوں کو پورا کرا لیا جائے جنہیں مسلم سوسائٹی کی فلاح، اسلام کا نظام اجتماعی کے استحکام اور امن و عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اسلام نے قانونی اہمیت دی ہے

۴۔ قانونی ممنوعات۔

قانون نہ افراد کی اصلاح کرتا ہے، نہ تعمیر معاشرہ کا فرض انجام دیتا ہے، بلکہ قانون کا کام صرف مفسدات کو بہ پیش نکلنے کے بعد روک دینا، اور ان کے اثر سے دوسروں کو بچانا ہے۔ قانون کا عمل اثباتی نہیں، بلکہ منفی ہے۔ قانون کی حیثیت درحقیقت مطب کی دواؤں کی سی ہے کہ مرض اور اس کی علامات کا مقابلہ کرنے کے لئے ان سے مدد لی جاتی ہے لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صحت و قوت کی تعمیر دواؤں سے ہوتی ہے۔ صحت و قوت کے لئے تو بہرحال غذا، صفائی، ورزش اور باقاعدگی وغیرہ اسباب سے کام لینا ناگزیر ہے بالکل اسی طرح افراد کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح اور صالح معاشرہ کی تعمیر قانون سے نہیں بلکہ کسی نصب العین اور اصول و عقاید اور اخلاقی اقدار کے لئے مختلف ذرائع سے تعلیم اور تربیت دینے سے ہوتی ہے۔ قانون صرف اخلاقی فتنہ کے رونما ہو جانے پر اس کو روکنے کے لئے کام کرتا ہے پس مسئلہ سیاسی ہو یا معاشی بہرحال ہیں اصل اصلاح و تعمیر تو تعلیم و تربیت، اور تزکیۂ فکر و عمل سے ہوتی ہے، قانون صرف غیر اصلاح پذیر عناصر کو نشوونما پانے سے روکنے کا کام کرتا ہے۔ ٹھیک یہی مقام ہے جو اپنی معاشی اصلاح کی اسکیم میں اسلام نے قانون کو دیا ہے۔ اس کے ہاں ایسے قانونی ممنوعات جن کی حیثیت اصولی ہے، صرف گنتی کے پائے جاتے ہیں، لیکن ان ممنوعات کو وہ پوری سختی سے روکتا ہے۔ اور یہ جتنے مختلف روپ بدل کر

معاشیات میں رونما ہوتے ہیں، کسی روپ میں ان کو گوارا کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ اسلامی معاشیات کے منصوص اور فقہی قوانین کی فہرست پیش کی جائے۔ بلکہ مجھے صرف یہ تصور دلانا ہے کہ کن معاشی مفسدات کو روکنے کے لیے اسلام نے قوانین کے جنگلے کھڑے کئے ہیں۔ اسلام کے معاشی قوانین اپنے مقاصد کے لحاظ سے جن قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین قسمیں یہ ہیں:

(۱) وہ قوانین جو دوسروں کے حق ملکیت میں دخل اندازی کرنے سے روکنے کے لیے ہیں۔

(۲) وہ قوانین جو دولت عامہ پر کسی اجارہ داری اور شخصی ملکیت کے قیام میں مانع ہیں۔

(۳) وہ قوانین جو سوسائٹی کو اخلاقی نقصان پہنچا کر نفع اندوزی کرنے سے باز رکھنے والے ہیں۔

(۴) وہ قوانین جو دولت کو تعیشات پر صرف کرنے سے روکنے کے لئے ہیں۔

(۵) وہ قوانین جو معاشرہ کی حقیقی خدمت کے بغیر زراندوزی کرنے سے روکتے ہیں۔

(۶) وہ قوانین جو ایسے معاملات کی روک تھام کرتے ہیں جن سے جھگڑے پیدا ہوں یا جن میں اصولاً ایک فریق کے نقصان پر دوسرے فریق کے نفع کا دارومدار ہو۔

(۷) وہ قوانین جو کاروباری معاملات کو فریب دہی سے پاک کرنے کے لئے ہیں۔

(۸) وہ قوانین جو لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی صورتوں کی روک تھام کے لئے ہیں۔

(۹) وہ قوانین جو سوسائٹی کی مالی ضروریات کا بار مالدار کے کندھوں پر ڈالتے ہیں۔

(۱۰) وہ قوانین جو دولت اور ذرائع وسائل کو ایک جگہ سمٹنے سے روکنے اور ان کو پھیلانے اور گردش دینے کے لئے مخصوص ہیں۔

اسلام کا یہ متوازن قانونی نظام صرف اسی صورت میں ہو کر کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے جبکہ اس کی بنائی ہوئی اعتقادی اور اخلاقی بنیادوں پر ایک صالح تعمیر ہو۔ ایسے اندر اسلام کے معاشیاتی قوانین ٹھیک وہ کام کرتے ہیں جو کسی مضبوط قلعہ کی برجیوں میں بیٹھے ہوئے دیدبان اور سنتری کرتے ہیں۔ اگر یہ قلعہ جا بجا سے شکستہ ہو اور اس کی دیواروں میں بڑے بڑے رخنے موجود ہوں اور اس کے کواڑ اپنی جگہ چھوڑ چکے ہوں

تو جب تک اس کی تعمیر جدید کا سامان نہ کیا جائے محض برجیوں پر بیٹھے ہوئے دیدبان اور سنتری معاشی مفاسد کے لشکروں کو اندر داخل ہونے سے نہیں روک سکتے۔ اسلام کے معاشیاتی ضوابط اتنے وسیع اور دور رس ہیں کہ انہیں اگر ایک صالح معاشرے میں نافذ کیا جائے تو کوئی ایسا چور دروازہ کھلا ہی نہیں رہتا جس سے سرمایہ داری کا شیطان گھس سکے، اور ان قوانین کی روح اگر محفوظ رہے تو ناممکن ہے کہ مسلم سوسائٹی کے اندر معاشی ناہمواریاں رونما ہو کر حدت ملی کو پارہ پارہ کر دیں۔ اس قانونی نظام کے اندر یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص اچھی وافر بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے اللہ کے خزانۂ رزق میں سے کوئی بڑا حصہ پالے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ دوسروں سے ان کے حصوں کے وظائف رزق چھینتا ہوا، اور ان کی حق ماری کرتا ہوا سیم و زر کے انبار جمع کر سکے۔

(۲)

اب تک میں نے اسلام کی معاشی اسکیم کو علمی نقطۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی معاشروں کو معاشی ناہمواریوں سے بچانے کے لئے اسلام ایک مفصل منصوبہ (Plan) اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ ایک خاص ذہنیت بناتا ہے۔ ایک خاص طرز کا اخلاق سکھاتا ہے۔ ایک خاص طرز پر سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے۔ اور پھر ایک خاص قانونی نظام برپا کرتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اسلام کی جو اسکیم میں نے بیان کی ہے اس کی روشنی میں آپ کو پاکستان کے مختلف معاشی مسائل کے عملی حل کا تصور بھی دلا دوں تاکہ آپ اسلامی نظام کی فوقیت کو صحیح انداز میں سمجھیں۔ اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے مقابلے میں اس کی قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

میں اپنی تقریر کے اس دوسرے حصے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرارداد مقاصد کے تقاضوں کے مطابق اب اگر پاکستان کا چارج خدا و رسول کو دے دیا جائے تو وہ ہمارے ہاں کی معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لئے اپنے خاص اصولوں کے تحت کیسی تدابیر اختیار کرے گا۔ اور یہ کہ اسلامی نظام کا نام لینے والوں کی ذمہ داریاں اس بارے میں کیا ہیں؟

چونکہ ہماری معاشی [illegible] کا سد باب ہے اہم آج جن معاشی ناہمواریوں سے دوچار ہیں ان کے پیدا کرنے والے

مختلف وجوہ میں وہ بڑے بڑے کاروباری مفاسد بھی شامل ہیں جو آج کی مارکیٹ کی رگ رگ میں خون بن کر گردش کر رہے ہیں۔ جب تک ان زہریلے عناصر سے کاروبار کے عروق و اعصاب کو پاک نہ کر لیا جائے ہم معاشی ناہمواریوں کی اصلاح پر کبھی قادر نہیں ہو سکتے۔

ان کاروباری مفاسد میں اولین اہمیت سود کی ہے۔ ہمارا نظام معیشت سودی نظام معیشت ہے اور سود کا وجود اسلام کی عین نفی ہے۔ سود کو اسلام نے اعتقادی، اخلاقی اور قانونی ہر لحاظ سے حرام ٹھہرایا ہے۔ اور پھر سود کی حرمت کی نوعیت اتنی شدید بتائی ہے کہ ایک مسلمان سوسائٹی کے لیے سودی نظام معیشت کا جاری رہنا ناقابل برداشت عذاب ثابت ہونا چاہیے۔ قرآن نے سود خواروں کو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کا پیغام سنایا یعنی خدا اور رسول کی طرف سے سود کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا۔ پھر سود خواری ہی نہیں، بلکہ سودی معاملات کی دستاویزات لکھنے اور حسابات رکھنے کو بھی قابل مواخذہ جرم قرار دیا گیا۔ دوسری طرف حدیث نبوی نے سود کے جرم کا بھاری پن اور اس کے اثرات بد کی وسعت کو واضح کرنے کے لیے یہ حقیقت بیان کی کہ سود خواری کا گناہ ستر مرتبہ کی زنا کاری سے بھی زیادہ شدید ہے۔ حرمت ربوا کی اس نوعیت کو معلوم کر لینے کے بعد نبی صلعم کے صحابہ نے اپنے آپ کو نہ صرف ربوا سے پوری طرح بچایا ہے بلکہ وہ معاملات جو ظاہراً سودی معاملات نہ ہوں لیکن ان میں ربوا کا رنگ یا شائبہ پایا جائے یعنی سودی معاملات سے مشابہت رکھتے ہوں ان سے بھی پوری طرح اجتناب کیا۔

سود کی حرمت کی اس شدت کے محسوس کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ سود کی قسم بندیاں کرے، اور پھر اس بات کی فقہی گنجائشیں ڈھونڈے کہ فلاں قسم کا سود اگر حرام ہے تو فلاں قسم کا سود کمانے میں شریعت مانع نہیں ہے۔ لیکن مغالطہ پذیر ذہنوں نے یہ بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شخصی سود خواری تو حرام ہے، بینکوں کے سود کو اسلام کیسے حرام قرار دے سکتا ہے جو کاروبار کی ترقی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور جو درحقیقت سود نہیں بلکہ منافع تقسیم کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ اسلام کو نہ سمجھنے کی دلیل ہیں، بلکہ جدید معاشیات اور دور حاضر کے بینکنگ سسٹم کو نہ سمجھنے کی گواہی بھی دیتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بینک کے سود کی ماہیت پر چند باتیں عرض کر دوں۔

بنکوں کو سود بنک کے سود میں ٹھیک وہی خباثتیں پائی جاتی ہیں جو شخصی سودی معاملات میں ہوتی ہیں؛ اس کا ظاہر بدل جاتا ہے، باطن نہیں بدلتا۔ بنک کے سود کی حقیقت یہ ہے کہ بنک جن لوگوں کے سرمائے سے چلتے ہیں وہ اپنے لاکھوں اور کروڑوں روپے بنک کے کاروبار میں اس بھروسے پر لگاتے ہیں کہ ان کو بہر حال کے خاتمے پر اتنے فیصد منافع ادا کر دیا جائے چاہے بنک کو نفع ہو یا نقصان، یا نفع ہو تو کم نفع ہو یا زیادہ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ بنک اپنے دفاتر اور ذخائر کے اندر سے تو یہ منافع نکال کر سرمایہ داروں کو دے نہیں سکتا اور نہ ان کے جمع کردہ روپے میں نسل کشی کی استعداد موجود ہے۔ بنک بہر حال ایک طرف سے لیکر ہی دوسری طرف دے سکتا ہے چنانچہ کوئی بنک جب اپنا سرمایہ بڑے بڑے کاروباری اداروں اور صنعتی کارخانوں میں لگاتا ہے تو وہ بھی اسی اصول پر شرح منافع پہلے سے طے کر لیتا ہے ٹھیک اسی طرز پر کاروباری ادارے اور صنعتی کارخانے اپنی مصنوعات اور مال تجارت کی قیمتوں میں سود کی وہ رقم شامل کر دیتے ہیں جو بنکوں کی طرف سے ان کے ذمے آتی ہے۔ یہاں تک کہ سود کی بلا آخر کار ضروریات زندگی کے اس آخری عام گاہک کی جیب پر آپڑتی ہے جو اس کو کسی دوسرے پر پھینک نہیں سکتا۔ یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک ملک کے بنک کئی کروڑ روپیہ سالانہ کی جو رقم منافع کے نام سے اپنے حصہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ اس ملک کے غربا اور عوام ہی کی جیبوں سے غیر محسوس طریق سے نکل کے آتی ہے۔ ایک سودی نظام معیشت کے تحت آپ بازار میں جا کر اگر ایک آنے کی شکر یا تین پیسے کی دیا سلائی بھی خریدتے ہیں تو اس ایک آنے اور تین پیسے میں بھی سرمایہ داروں کا وہ چندہ شامل ہوتا ہے جسے بنک منافع کے نام سے تقسیم کرتے ہیں۔ جس سوسائٹی میں بنکوں کا سود جائز قرار دیا گیا ہو اس میں کسی متقی ترین فرد کے لئے بھی یہ ممکن نہیں رہتا کہ اپنے دامن کو سود کے داغ سے پاک رکھ سکے۔ حرام کا یہ ہمہ گیر زہر حلال اور پاک اشیا میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ سودی نظام میں قدرتی طور پر اشیا کی قیمتوں کے ساتھ سود کا بار شامل ہو کر ان کو بوجھل بنائے رکھتا ہے۔ دوسری طرف ربائی حیثیت ملک کے چند مالدار افراد کے پاس بڑی دولت کو ہر طرف سے سمیٹ سمیٹ کر لے آتی ہے اور اس کا نتیجہ خطرناک ناہمواریوں کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔

پس اسلام کے فلسفے کے مطابق اگر معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنا ہو تو پھر سوسائٹی کو سود سے پاک کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ سود اگر کتاب و سنت کی رو سے حرام ہے تو اسے پاکستان کی اسلامی ریاست میں قانونی

سود بھی حرام بھی ہونا چاہیئے۔

سود کی حرمت کو عملی جامہ پہنانے کا ذکر آتے ہی یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ اگر سود کو قطعی طور پر ممنوع ٹھہرا دیا جائے تو بنکنگ سسٹم کا سرے سے خاتمہ ہو جائیگا۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ بنکوں کے بغیر آج نہ تجارت چل سکتی ہے۔ اور نہ حکومت کے مالیات کا انتظام ہی برقرار رہ سکتا ہے۔

یہ سوال یقیناً ایک وزنی سوال ہے۔ اور آپ کے سامنے جو لوگ سود کی حرمت کا پیغام لا رہے ہیں۔ وہ اس سوال کی اہمیت سے غافل نہیں ہیں۔ لیکن وہ اس کو لاینحل نہیں سمجھتے۔ اور در حقیقت دنیا میں کوئی سوال لاینحل نہیں ہے بشرطیکہ کسی قوم اور حکومت میں اس کے حل کرنے کا سچا عزم موجود ہو۔ ایک ایسا گروہ جو اپنے اصولوں کا محافظ و پاسبان ہوتا ہے۔ وہ ان کو قائم کرنے کے لئے سو راہیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اپنی دنیا آپ بنانے کا ولولہ موجود ہو اور خودی اتنی زندہ ہو کہ دوسروں کے در پر اصول و افکار کی گدا گری کی ذلت کو گوارا نہ کر سکے۔ یہ اوصاف اگر کسی گروہ میں نہیں ہیں۔ تو اس کے لئے اس آسمان کے نیچے حقیقی آزادی نہ پہلے کبھی تھی اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔

اسلامی نظام معیشت آپ کو ایک نئے بنکنگ سسٹم کے قائم کرنے کے لئے سود کے اصول کے بجائے مضاربت کا اصول مہیا کرتا ہے۔ اصول مضاربت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طرف کا سرمایہ اور دوسری طرف کی محنت باہم متعاون ہو کر کام کریں اور نتائج میں کسی طے شدہ تناسب کے مطابق دونوں شریک ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اصولِ مضاربت کے معنی حصہ داریِ نفع و نقصان[1] کے ہیں۔ اس اصول پر اگر بنکوں کو سرمایہ دیا جائے۔ اور کسی

---

[1] ایک صاحب نے مجھ سے کراچی میں یہ سوال کیا تھا کہ سرمایہ پر سود دیا جائے یا منافع دونوں صورتوں میں واقعہ کی حقیقت میں تو کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ سو جس طرح سود کا بار اشیاء کی قیمتوں پر پڑتا ہے، اسی طرح منافع کا بار بھی تو پڑیگا۔ پھر فرق کیا ہوا؟

اس کے جواب میں میں نے ان کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ سود کی مقدار چونکہ پہلے سے طے ہوتی ہے اس لئے وہ مصنوعات کے مصارف تیاری (Cost of Production) میں شامل کر دی جاتی ہے۔ بلکن حصہ داریِ نفع کے اصول پر جو سرمایہ صنعت میں لگایا گیا ہو۔ اس کی مقدار پہلے سے معلوم نہیں ہوتی اس لئے اشیاء کے مصارف تیاری میں شامل نہیں کیا جا سکتا بلکہ برعکس اس کے مارکیٹ میں ... کے رو سے جب کسی سرمایہ پر نفع یا نقصان نمودار ہو چکتا ہے تب اس کی تقسیم ہوتی ہے۔ دوسرا فرق اصول سود اور اصولِ مضاربت میں یہ ہے کہ اول الذکر اصول کے تحت سرمایہ دار نفع تو لے لیتا ہے لیکن نقصان سے صاف بچ کر نکل جاتا ہے لیکن دوسرے اصول کے تحت اگر وہ نفع لیتا جاتا ہے تو اسے نقصان کا بار بھی بہرحال اٹھانا پڑتا ہے۔ جہاں دو وجوہ سے اصول سود اور اصول مضاربت ...

اصول ہو اگر بنک تجارتی اور صنعتی اداروں کو سرمایہ فراہم کریں تو صنعت و تجارت کا سارا انتظام بھی نہایت بہتر طریق سے چل سکتا ہے اور ان کے مالیات کو بھی نئے انداز سے استوار کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر داخلی ضروریات کے لئے اس طرح کا کوئی بنکنگ سسٹم چل بھی نکلے تو بہر حال بین الاقوامی مالی اور تجارتی روابط کے لئے یہ بکار آمد نہیں ہو سکتا۔ اصول مضاربت پر ہم بیرونی سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اس اصول پر چلنے والے بنکوں کو تجارت خارجہ کا وسیلہ بنا سکتے ہیں۔ ہم اس بارے میں یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کوئی بھی اصول جب تک اپنے گھر میں اختیار کر کے کامیابی کی منزل تک پہنچا نہ دیا جائے، اس کے لئے گھر سے باہر کبھی بھی قبولیت حاصل نہیں کی جا سکتی بہر حال ایک نئے بنکنگ سسٹم کو آپ چند سال میں اپنے ہاں پروان پڑھا کر اسے سودی سسٹم سے بہتر ثابت کریں گے۔ اور پھر اس کے حق میں مرعوب کن لٹریچر کی ایک بڑی مقدار دنیا کے ممالک کو فراہم کر دیں گے تب کہیں دنیا اس سسٹم پر اعتماد کر سکے گی، اور جب تک یہ منزل نہ آ جائے آپ کو اپنے بین الاقوامی مالی و تجارتی روابط میں سود کی آلائش کو اضطراراً گوارا کرنا پڑیگا لیکن جب یہ منزل آ جائے گی، تو شاید آپ کو وہ دن دیکھنا بھی نصیب ہو گا جب کہ آپ سرمایہ دار ملکوں سے یہ مطالبہ کریں گے کہ جیسے ہم سے تجارتی و مالی تعلقات رکھنے ہوں وہ اپنے ہاں غیر سودی بنکنگ کو قائم کرے کیونکہ ہم سودی معاملات سے قطعی طور پر الگ ہو چکے ہیں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ہاں سے تربیت پا کر لوگ جائیں گے۔ اور اپنے ملکوں میں غیر سودی بنکنگ سسٹم کا نیا تجربہ کریں گے اور پوری دنیا پر آپ کا اصول مضاربت چھا تا چلا جائیگا۔

اس مہم کے سر کرنے میں جو مشکلات بیان کی جاتی ہیں وہ بہر حال اتنی ضرور ہیں جتنی ایک پرانے نظام کو چھوڑ کر نئے نظام کو برپا کرنے میں پیش آیا کرتی ہیں اور ان کو حل کرنے میں یقیناً عرق ریزی کرنی پڑیگی۔ آپ کے ملک کے علمائے دین اور علمائے معاشیات کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہو گا - اور دو طرفہ معلومات کی روشنی میں اصول مضاربت پر بنکنگ سسٹم کے قائم کرنے کا منصوبہ تیار کرنا ہو گا پھر اس منصوبہ کے مطابق ابتداءً چھوٹے پیمانے پر حکومت اپنی نگرانی میں تجربتہً ایک نیا بنک قائم کریگی جو پھر بتدریج پھیلے گا۔ یہاں تک کہ جب اس کا انتظام چل نکلے گا تو آہستہ آہستہ دوسرے بنک اسی کے مطابق ڈھلنے شروع ہو جائیں گے۔ ان تجربات کے ساتھ ساتھ اسلامی بنکنگ کی نئی سائنس خود بخود ارتقا کریگی اور اس کے لئے لٹریچر مرتب ہوتا جائیگا۔ اور ماہرین فن تیار ہو کر میدان کار میں آنے جائیں گے۔ اس سلسلے میں اولین اقدام یہی ہے۔ کہ تبدیلی کا فیصلہ کر لیا جائے جس دن ہم سود کے شیطان کو ملک بدر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دن معاشی ناہمواریوں کی ایک بڑی علت کا خاتمہ ہو جائیگا۔

ذخیرہ اندوزی اور سٹہ سود کے بعد دوسرے درجے پر جو فتنہ انگیز خباثت ہمارے کاروبار میں دخیل ہے، وہ ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی کی ہے۔ موجودہ بگڑے ہوئے نظام کے تاجر عوام کی خدمت کر کے حلال روزی کمانے کے بجائے عوام کو دکھ دے کر حرام کمائی کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ نہیں کہ جس چیز کی کمی ہو رہی ہو، اسے فراہم کر کے حق الخدمت وصول کریں، بلکہ ان کی روش یہ ہے کہ جو چیز عوام کو آسانی سے مل سکتی ہو، اس کے ذخائر جمع کر کے روک رکھے جائیں۔ اور عوام کو اتنا ترسایا جائے کہ پھر ان کی جیبیں کاٹنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ یہ غیر فطری کمائیاں کرنے کا ایک ایسا ڈھنگ ہے جس کی وجہ سے سوسائٹی میں لازماً معاشی ناہمواریاں فروغ پاتی ہیں۔ موجودہ بنکنگ سسٹم نے اس ذخیرہ اندوزی کے جرم کو بیمانۂ کبیر پر عمل میں لانے کیلئے سہولتیں پیدا کر دی ہیں اور اس مجرم کے لئے نقد سرمائے کی تنگ دامانی کو وسعت میں بدل دیا ہے کہ نقد سرمائے کے استعمال کئے بغیر ذخائر اجناس کو قید میں رکھا جا سکتا ہے پھر ان اجناس کے خیالی "خیالی" سودے ہوتے رہتے ہیں اور ہر سودے کا منافع ان کی قیمتوں پر اپنا بوجھ ڈالتا چلا جاتا ہے جو آخر کار عوام کی جیبوں پر جا کے پڑتا ہے پھر بڑے بڑے تاجر جب مل جل کر کاروباری گٹھ جوڑ قائم کر لیتے ہیں اور ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی کی پوری فضاؤں پر چھا جاتے ہیں تو پھر منڈی اور کاروبار ان کے بے بس غلام بن جاتے ہیں۔ قیمتیں ان کے اشارۂ ابرو پر ناچتی ہیں، چھوٹے تاجر ان کی اجارہ داری کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ حکومت کے مالیات پر بھی یہ ہر طرح کا اثر ڈالنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

یہ سٹے اور ذخیرہ اندوزی کا نظام لازماً معاشی ناہمواریوں کو ترقی دیتا ہے۔ اور عوام پر بڑے بڑے تاجروں کی ناروا کمائیوں کا بوجھ بلا واسطہ ڈالتا ہے۔ اسلام ان دونوں مفاسد کا دشمن ہے اور اس کے نظام معیشت میں کاروبار کو جن اصولوں پر منظم کیا جائیگا ان کے فریم میں ان دونوں سرمایہ دارانہ اصولوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

دوسرے کاروباری مفاسد ان دو بنیادی مفاسد کے علاوہ کاروباری دنیا میں اور بھی بہت سے وجوہِ فتنہ پائے جاتے ہیں اور اسلام ان میں سے کسی کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اسلام کے ضابطۂ تجارت میں لین دین اور معاملات کی بہت سی ایسی شکلیں ممنوع ٹھہرائی گئی ہیں جو اجتماعی اخلاق کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں اور معاشی ناہمواریوں میں بھی اضافہ کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ان مختلف شکلوں کی تفصیل میں اس تقریر میں نہیں کر سکتا، فقہ کی کتابوں میں معاملات کے کئی باب ان کو محیط ہیں۔ کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ اسلام کے کاروباری ضوابط کے اصول و حِکَم کو پیشِ نظر رکھ کر دورِ حاضرہ کے کاروبار کے پیچیدہ نظام کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جائے اور ان میں جو مفاسد کارفرما ہیں ان کی روک تھام کے لئے اسلامی ذہنیت کے ساتھ جدید فقہ بندی کی جائے

جاگیروں کا محاسبہ پاکستان میں جن ناہمواریوں کو نہایت شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے، ان میں اکثر و بیشتر وہ ہیں جو دنیائے زراعت سے متعلق ہیں پس پاکستان جیسے زرعی ملک میں زمین کے مسائل اپنے حل کے لئے اولیں توجہ چاہتے ہیں۔ ان مسائل میں سے ایک نمایاں مسئلہ جاگیروں کا ہے۔

اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے میں پوری صفائی سے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں، کہ ہم لوگ جاگیروں کے مسئلے کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے پر کبھی تیار نہیں ہیں جو عام طور پر فضا میں رائج ہے ہم اس معاملے میں جو کچھ رائے بھی قائم کر سکتے ہیں، اپنے علم کی حد تک اصول کو کتاب و سنت کی ہدایت سے اخذ کرتے ہیں اور اگر کتاب و سنت کی رُو سے ہماری رائے کی غلطی ہم پر واضح کر دی جائے تو بہر لحظہ اس میں ترمیم کرنے کو تیار ہیں۔ اسلام اگر کسی جاگیر کو جاگیردار کے پاس چھوڑنا چاہے تو چاہے ساری دنیا مل کر اس کے سلب کرنے کا فیصلہ کرے، ہم بہر حال اس فیصلہ کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکیں گے، اور اسی طرح اگر اسلام ساری جاگیروں کو جاگیرداروں سے سلب کر کے حکومت کی تحویل میں لانے کا یا کسانوں میں بانٹ دینے کا اشارہ کرے تو چاہے کتنی ہی بڑی طاقتیں اس اشارہ کو جھٹلانے کی کوشش کریں، ہمارے نزدیک یہی اشارہ واجب التعمیل ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اصل مسئلہ کی طرف آیئے۔ نظام جاگیرداری کئی سو سال تک پوری دنیا پہ مسلط رہ چکا ہے اور زمین کے بعض گوشوں میں اب تک اس کا چلن باقی ہے۔ خود پاکستان میں بھی اس کے آثار موجود ہیں۔ اس نظام کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ سلطان وقت یا حکومت اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ملک کے ایسے تمام با اثر اور نمایاں اشخاص کی وفاداریاں خرید لیتی ہے جو اگر تعاون کریں تو سلطنت مستحکم رہتی ہے اور بگڑ جائیں تو تخت کے پائے متزلزل ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وفاداریوں کی خریداری کے لئے دوسرے مختلف ذرائع کے ساتھ ساتھ جاگیر کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاتا رہا ہے "جاگیر" صرف ایک قطعہ زمین ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس قطعہ زمین کے ساتھ کسانوں اور کمیوں کی ایک بڑی رعیت بھی ہوتی ہے جس کی آزادی اور معیشت کو حکومت ایک با اثر شخص کی وفاداری کی خرید کے لئے داؤ میں لگاتی ہے جاگیردار حکومت کو فوجی قوت بھی فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور مالی قوت بھی ——— اور اس کے صلے میں وہ اپنے حلقہ اثر کے افراد انسانی پر خدائی کا حق حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح سے سالہا سال کے مسلسل عمل نے جاگیرداری کے ساتھ نہایت ذلیل اور گھناؤنی روایات وابستہ کر دی ہیں اور جہاں کوئی جاگیر پائی جاتی ہے اس کے ساتھ یہ روایات کسی نہ کسی درجے میں موجود ہوتی ہیں۔

مغلیہ دور حکومت میں جاگیر کی یہ نوعیت بکثرت پائی جاتی تھی لیکن اس کے علاوہ جاگیروں کی ایک قسم داد و دہش اور بخشش

کی صورت میں بھی وجود میں آتی رہی ہے۔ ان دو قسموں کے علاوہ ایک تیسری قسم صلۂ خدمات کی بھی تھی یعنی حکومت بعض مواقع پر نقد تنخواہ یا انعام کے بجائے زمین اپنے کارکنوں کو تفویض کر دیتی تھی۔

انگریزی دورِ حکومت میں نظامِ جاگیرداری اپنی عمر کی آخری منزلوں میں داخل ہو گیا تھا، لیکن پھر بھی پہلے کی بے شمار جاگیریں موجود تھیں اور بحال رہیں۔ اور انگریز حکام نے بھی جاگیر کو وفاداریاں خریدنے کا ذریعہ بنانا اپنے لئے مناسب سمجھا، چنانچہ ایک نظامِ باطل کو عام ہندوستانی باشندوں کے علاوہ خود ملتِ اسلامیہ پر مسلط کرنے کے لئے جاگیر دے کر بے شمار ناہل جوانوں کو مجاہد بنا کر نیچے کے سامنے صف آرا کر دیا۔

جاگیرداریوں کی ان نوعیتوں کے سامنے رکھنے کے بعد جب ہم اسلامی نقطۂ نظر سے پیشِ نظر مسئلہ کو سوچتے ہیں، تو ہمیں تاریخِ اسلام سے اس بات کا ثبوت تو ملتا ہے کہ اسلامی حکومت نے اپنے کارندوں کو بعض اوقات معاوضۂ کار کے طور پر زمینیں تفویض کی ہیں لیکن ان کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کی ناپاک روایات کبھی نہ تھیں اور نہ ان کو اسلامی حکومت نے خدا کے بندوں کے حقِ آزادی، حقِ مساوات اور حقِ معیشت کے سلب کرنے کا ذریعہ بننے دیا ہے لیکن خاص طور پر وہ جاگیریں جن کو ایک نظامِ باطل کے قیام و تسلط کے لئے استعمال کیا گیا ہو اور جن کو تجدید و احیائے دین کی ہر کوشش کو کچلنے اور اسلامی تہذیب کو شکست دینے کے لئے ذریعہ بنا لیا گیا ہو اُن کے بارے میں اسلام سے جواز کا فتویٰ بہر حال نہیں مل سکتا علاوہ ازیں کا مسئلہ اسلامی ریاست اور مسلم سوسائٹی کی کسی اجتماعی ملکیت کو شاعروں کے قصیدوں اور بھانڈوں کے لطیفوں پر لٹانے کی اجازت اسلام کے قانون نے کبھی نہیں دی چنانچہ حضرت خالد جیسے چوٹی کے قابلِ اعتماد حاکم نے جب ایک شاعر کو اس کے کلام پر دس ہزار درہم بطور انعام دیئے تو حضرت عمرؓ نے اس پر شدید گرفت کی مقدمہ چلایا اور اسی معاملے پر ان کو معزول کر دیا۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ پاکستان میں جو جاگیریں امتِ محمدی کے لاکھوں افراد پر ظلم کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور جن میں سے بیشتر وہ ہیں جو کسی جائز بنا پر وجود میں نہیں آئیں، کیا ان کو سلب کرنے کے لئے اسلام میں کوئی سندِ جواز ہے؟ کوئی صریح آیت یا حدیث یقیناً اس سوال کا دو ٹوک جواب دینے کے لئے موجود نہیں ہے، لیکن اصولاً یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایک ظالم حکومت نے اگر پبلک کے اموال و املاک کو ناجائز طور پر لٹایا ہو تو اس حکومت کی جانشین حکومت اس کے فیصلوں کو بدل کر اصلاح کر سکتی ہے پھر خصوصاً معاملہ اگر امتِ مسلمہ کے اجتماعی اموال و املاک کا ہو اور انہیں کسی مسلم یا غیر مسلم حکمراں نے اسلام کی ہدایات سے قطع نظر کر کے ظالمانہ طریق پر چند افراد کے تصرف میں بعض حرام مقاصد کے لئے دے دیا ہو تو ایک

صحیح اسلامی حکومت وجود پاتے ہی سابق حکومت کے غلط تصرفات پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتی ہے۔

میرے اس دعویٰ پر خلافت راشدہ کے ایک سے زائد عملی نظائر موجود ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ:۔

(ا) عراق پر جب اسلامی حکومت کا قبضہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے خاندان شاہی کی ساری جاگیروں کو سلب کر کے اسلامی بیت المال کی ملکیت قرار دے دیا۔

(ب) رومی حکومت نے جب شام اور مصر پر قبضہ کیا تو تمام اراضیات اصلی باشندوں سے چھین کر درباریوں اور فوجی افسروں اور شاہی خاندان کے افراد کی جاگیروں میں بدل دیں اور کچھ کلیسائی معبدوں کے لئے وقف کر دیں حتیٰ کہ مقامی آبادی کے پاس جیسے بھر ملکیتی زمین بھی باقی نہ رہی بلکہ اصل باشندگان ملک خود اپنی زمینوں میں مزارعین بن کے رہ گئے حضرت عمرؓ نے جونہی ان ممالک پر قبضہ کیا، تمام جاگیرداریوں کو اصل مقامی مالکوں کی طرف لوٹا دیا، بلکہ مقامی مظلوم باشندوں کی دلجوئی کی خاطر مسلمانوں کو کسی زمین پر قبضہ کرنے یا کسی قطعہ ارضی کے خریدنے سے خاص طور پر روک دیا۔

(ج) اوپر کی دونوں نظیریں اُن جاگیروں کے متعلق ہیں جو غیر مسلم حکمرانوں نے قائم کی تھیں لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو خلفائے راشدین کی صف میں شریک ہیں، ان جاگیروں کے بارے میں بھی ایک قطعی نظیر قائم کر دی ہے جو مسلم حکمرانوں نے غلط مقاصد کے لئے قائم کی ہوں۔ آپ نے مسند آرائے خلافت ہونے کے بعد پہلا بڑا کام یہی کیا کہ تمام جاگیروں کے قبالے مسجد میں مجمع عام کے روبرو طلب کئے۔ پھر اپنے بیٹے کو پاس بٹھلیا جو ایک ایک جاگیر نامے کو پڑھتے جاتے تھے اور حضرت عمرؒ اسے کالعدم قرار دیتے جاتے تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی اور اپنے اقربا کی جاگیروں کے قبالوں کو قینچی کے حوالے کیا۔ پھر شاہی خاندان کے دوسرے ارکان اور درباریوں کے قبالوں کو پرزے پرزے کیا۔ یہاں تک کہ کوئی جاگیر نامہ بھی سلامت نہ رہا۔ اس کارروائی کو دیکھ کر بعض لوگ تلملائے۔ اس پر ابن عبدالعزیزؒ نے ان کو متنبہ کیا کہ خبردار! اگر میرے راستے میں روڑے اٹکاؤ گے تو میں اس خلافت کو جو امانۃً مجھے سونپی گئی ہے، سے جا کے مدینے کے عوام کے حوالے کر دوں گا! چنانچہ بڑے بڑے جاگیردار دم بخود ہو کے بیٹھ رہے۔ ان نظیروں کی روشنی میں ہم کو ان ساری جاگیروں کا محاسبہ کرنا ہو گا جن کے متعلق کاغذات مال و اراضی سے ضروری معلومات مل سکتی ہیں پھر تمام ناجائز قسم کی جاگیروں کے قبالوں پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرح قینچی چلانی ہو گی ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت ہی نازک ذمہ داری کا کام ہے اور اسے سرانجام دینے کے لئے علمائے دین کا ایک بورڈ جاگیروں کی نوعیتوں اور ان سے تعلق رکھنے والے مسائل پر جب تک خوب اچھی طرح چھان بین کر کے کوئی باقاعدہ پروگرام مرتب کر کے نہ دے محض اندھا دھند کوئی کارروائی نہیں کی جا

سکتی، کیونکہ یہاں قومی ملکیت کا اصول پیشِ نظر نہیں ہے، بلکہ سوال خدا و رسول کی ہدایت کے اتباع کا ہے۔

بقیہ زمینداریاں جاگیروں کا مسئلہ اگر صاف ہو جائے تو پھر پاکستان میں بہت تھوڑی سی بڑی زمینداریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کو معاشی ناہمواریوں کے پیدا کرنے میں کچھ زیادہ دخل حاصل ہے۔ ان زمینداریوں پر فی الوقت اگر اسلام کے قانونِ وراثت کا ایک وار ہو جائے تو ان کے چار چار چھ چھ آٹھ آٹھ ٹکڑے ہو سکتے ہیں، اور پھر ایسی زمینداریاں شاید ہی باقی رہ جائیں گی۔ اسلام کے قانونِ وراثت کا عمل اگر بہت پیچھے سے کرنے کے لئے کوئی شرعی دلیل یا عملی نظیر موجود نہ ہو، تو بھی بہرحال آج جو لوگ زمینوں پر قابض ہیں اُن سے قانوناً یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان بننے یا قرار دادِ مقاصد کے پاس ہونے کی تاریخ کو ان کے پاس جو قطعات کسی متوفیٰ کے ترکے میں سے پہنچے ہیں، ان میں سے اپنا جائز شرعی حصہ رکھ کر بقیہ کو دوسرے شرعی وارثوں کے حوالے کر دیں۔ اس طرح بعض بڑی زمینداریوں کی کمر ایک ہی وار میں اور بعض کی آگے چل کے دوسرے وار میں ٹوٹ جائے گی۔

تین سالہ افتادہ زمینیں فقہ کا ایک قانون یہ ہے کہ اگر کوئی زمین تین سال تک افتادہ اور بنجر پڑی رہے اور اس کا مالک اُس کو آباد کرنے سے قاصر رہے تو مسلم سوسائٹی کے ہر فرد کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں جا کر ہل چلائے اور اسے آباد کرے، اور اس کا مالک قرار پا جائے۔ اسلامی حکومت کو یہ حق بدرجۂ اولیٰ پہنچتا ہے۔ یہ قانون نبی صلعم کے بعض فرمودات سے ماخوذ ہے اور خود خلافتِ راشدہ میں برسرِ عمل رہ چکا ہے۔ آج بھی اگر اسلامی نظام پاکستان میں قائم ہو تو یہ قانون دوبارہ زندہ ہو کے رہے گا اور پاکستان کے کئی لاکھ ایکڑ وہ بنجر رقبے جن سے ان کے مالک کوئی استفادہ نہیں کر سکتے غریب کسانوں کے لئے مباحِ عام ہوں گے کہ وہ ان پر قابض ہو جائیں یا اگر حکومت چاہے گی تو ایسے رقبوں پر قابض ہو کر اپنے انتظام سے ان کی آبادکاری کی کوئی اسکیم اختیار کرے گی۔

بنجر جنگلات اور چراگاہیں بہت سی جاگیریں اور زمینیں بنجر جنگلات اور چراگاہوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، حالانکہ شرعاً جنگلات اور چراگاہیں صرف خدا تعالیٰ کے لئے اور اس کی نیابت کرنے والی حکومت کے ذریعے مخصوص ہو سکتی ہیں، بلکہ کسی شخص کو ذاتی طور پر جنگل اور چراگاہ کو مخصوص اور احاطہ بند کرنے کا حق نہیں ہے، اور قانوناً اس قسم کی احاطہ بندیوں اور قبضوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی فقہ کا یہ قانون بھی بے شمار جنگلات اور چراگاہوں کو خاص ملکیتوں سے نکال کر عوامی ملکیت میں لا سکتا ہے اور معاشی ناہمواریوں کے دور کرنے میں اس سے بہت کافی مدد لی جا سکتی ہے۔

مزارعین کے حقوق مندرجہ بالا تدابیر کے اختیار کرنے سے زمینداروں کی خدائیاں بڑی حد تک کم ہو جائیں گی اور مزارعین

اس قابل ہو سکیں گے۔ کہ بے نیازانہ طور پر محنت کر کے اپنا حق وصول کریں۔ لیکن پھر بھی مزارعین کو اسلام کے منشا کے مطابق پورے حقوق دلانے کے لئے خاص تدابیر اختیار کئے بغیر کام نہ چلے گا۔

آج ہمارے ہاں کے کاشتکار کی ایک یہی مشکل نہیں ہے۔ کہ وہ پوری محنت کرنے کے باوجود زندگی کی کم سے کم ضروریات تک فراہم نہیں کر سکتا۔ بلکہ اسے زمیندار کی خداوندی کے سامنے ایک ذلیل قسم کی غلامی و عبودیت کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ ایسے نادرا قسم کے ٹیکس دینے پڑتے ہیں۔ اسے بیگاریں دینی ہوتی ہیں۔ اسے اپنے اسلامی حقوق اخوت و مساوات ہی نہیں، تمام انسانی شرف و آبرو تک زمیندار کی نذر کرنی پڑتی ہے۔ اسے بیٹھ پر کوڑے کھانے پڑتے ہیں۔ اسے جھوٹے مقدمات میں مبتلا کیا جاتا ہے اسے بلا کسی نوٹس کے یک بینی و دو گوش زمینداری کی حدود سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اس کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اور ان کی عصمتوں سے کھلم کھلا چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے۔ یہ حالات ایسے دردناک ہیں کہ ان کو دیکھ کر بہت سے نوجوان اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکتے اور ان کو انصاف کی راہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ کہ زمیندار سے زمین چھین کر انہیں مزارعوں کے حوالے کر دی جائے جن کے لئے وہ ظلم کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔

لیکن ہم ایک مسلم کا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے مزارعین کو ان کے جائز حقوق کے واپس دلانے کی جائز تدابیر اختیار کرنے کے پابند ہیں۔ مزارعین کے اسلامی حقوق ان کو واپس دلانے کے لئے اولین ضروری تدبیر یہ ہے کہ معاوضۂ محنت کے لئے اسلام کے اصول کفالت کو قائم کر دیا جائے یعنی جس کی پوری محنت لی جا رہی ہو اس کا کم سے کم معاوضہ اتنا ہونا چاہئے کہ اس کی اور اس کے کنبے کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ زمین کی کاشت سے تعلق رکھنے والے کاموں کے علاوہ کسان سے کوئی دوسرا کام اس کے رضاکارانہ فیصلے کے بغیر یا اسے معقول معاوضہ دیئے بغیر نہ لیا جا سکے۔ اگر کوئی زمیندار مارپیٹ کرے تو اسلام کے اصول عدل کے مطابق مظلوم کے ہاتھ سے خود اس کو پٹوا دینا اسلامی حکومت پر لازم ہو۔ کسان سے پیداوار کے مقررہ حصے کے سوا کسی قسم کے ٹیکس کی وصولی کا زمیندار کو کوئی حق حاصل نہ رہے۔

علاوہ بریں اس بات کا اہتمام کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمینداروں اور مزارعین کے درمیان سارا معاملہ تحریری ہو اور معاملہ کی ضروری شرائط قلمبند ہو جائیں، نیز فریقین کا معاہدہ ایک متعین مدت کے لئے ہو۔ تاکہ ایک کسان ناگہانی طور پر بے دخل کئے جانے کے خطرے سے آزاد ہو سکے!

لہ اسلامی حکومت زمیندار اور کسان میں پیداوار کی تقسیم کا تناسب بغرض اصلاح قانوناً بھی متعین کر سکتی ہے۔

مادی حقوق کو بحال کرنے کی ان تدابیر کے ساتھ ساتھ مزارعین کے اخلاقی حقوق کو بحال کرنے کے لئے ان میں اسلامی ذہنیت کے پیدا کرنے اور ان کی کچلی پسی ہوئی خودی کو چونکانے کے کام میں ایک عرصے تک تعلیم بالغاں کے مختلف ذرائع سے مدد لینی پڑے گی یہاں تک کہ وہ اپنے شرف کا احساس کریں اور روٹی کمانے کے لئے اپنی عزت میں کسی کمی کو گوارا نہ کریں۔ اس تعلیم و تربیت کی کامیابی صرف اسلامی حکومت کے سائے میں یقینی ہو سکتی ہے، جس کا بیت المال ہر وقت ایسے کسانوں کی کفالت کے لئے تیار رہے گا جن کو اپنے اسلامی حقوق سے ہاتھ دھوئے بغیر روٹی ہاتھ نہ آسکے۔ لیکن اپنے خداداد اسلامی حقوق میں وہ کوئی کمی کرنے پر راضی نہ ہوں ہمیں اپنے مزارعین کو یہ سکھانا ہوگا کہ وہ زمیندار کو تنے ہوئے قد کے ساتھ مسلمانوں کی طرح السلام علیکم کر سکیں، وہ نمازیں کسی جھجک کے بغیر اس کے برابر کھڑے ہو جائیں اور وہ اس کے روبرو برابر سرابر کی ایک آبرومندانہ نشست پر بیٹھ سکیں، وہ اس کی غلطیوں پر کھلم کھلا اسے ایک مسلم کی طرح ٹوک سکیں اور احکام خداوندی اور سنت نبوی کی تیغ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کر سکیں، یہ تربیت اگر حکومت کے ذرائع و وسائل سے ہو تو چند سال میں زمیندار کا نشہ خدائی ہوا ہو سکتا ہے۔ اور اسے محسوس کرایا جا سکتا ہے۔ کہ آنجناب کا مقام خدا کے بندوں ہی کی صف میں ہے!

(باقی آئندہ)

رسائل و مسائل

جماعت اسلامی اور انڈین یونین کا روپیہ

جماعت اسلامی کے متعلق اس کے بعض غیر ذمہ دار حریفوں کی طرف سے پہلے بھی یہ مفسدانہ پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ انڈین یونین کی طرف سے روپیہ ملتا ہے، اور اب جماعت کو بالکل میدانِ عمل میں آمنے سامنے دیکھ کر از سرِ نو اسی دروغ کو فروغ دینے کی کوششیں نہایت منظم طریق سے شروع ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ جماعت اسلامی کے بے شمار کارکن دن رات کا کام کاج چھوڑ کے تحریک اسلامی کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں اور پھر اکثر ایسے ہیں جو صاف ستھری زندگی بسر کرتے ہیں، پھر لٹریچر اور جرائد نہایت کثیر تعداد میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور جلسے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ لیکن کہیں چندہ کی اپیل نہیں کی جاتی ــــ پھر آخر روپیہ انڈین یونین سے نہیں آتا تو کہاں سے آتا ہے۔ اس سوال کو چھیڑنے والوں نے دو باقاعدہ افسانے بھی گھڑے ہیں۔ ایک یہ کہ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد جماعت اسلامی کا ایک آدمی مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس پہنچتا ہے اور وہاں سے روپیہ لاتا رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جماعت کے کارندے محاذِ کشمیر کی طرف سے جا کر شیخ عبداللہ کشمیری سے روپے لاتے ہیں۔

اس پروپیگنڈے کی نوعیت کو واضح کرنے کیلئے ہم صرف ان معترضین کے سامنے چند تصریحات رکھ دینا چاہتے ہیں جو مخلص ہیں اور فی الواقع صرف غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ باقی رہے اربابِ فتنہ سو ان کی فتنہ طرازیوں کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہے۔ انہیں جو کچھ کرنا ہو کر دیکھیں۔ ان سے ہمارا معاملہ خدا کی عدالت ہی میں نمٹے گا ــــ ہاں یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ دنیا میں بھی ان کی رسوائی کا سامان کر دے۔

* خاص طور پر یہ سوال ان دنوں بعض حلقوں میں بہت قابلِ غور بنا ہوا ہے کہ "مطالبہ" کی مہم میں حکومت کو جو تاریں اور خطوط وصول ہوئے ہیں ان کا صرفہ بھی لاکھوں تک پہنچتا ہے۔ جماعت اسلامی نے یہ خرچ آخر کہاں سے کیا ہے۔ خاص اس مسئلے میں بتا دینا ضروری ہے کہ جماعت نے تاریں یا خطوط اپنے پاس سے بھیجنے کے بجائے صرف ان لوگوں کو مطالبہ کے حق میں تائید کرنے پر دلائل سے تیار کیا ہے، انہوں نے اپنے پاس سے تاروں اور خطوط پر روپیہ خرچ کیا ہے۔ (ادارہ)

ہمارے ہاں گذشتہ پچاس ساٹھ سال میں جتنی جماعتیں بنی ہیں ان کے مالیات کا دارومدار تین قسم کے ذرائع آمدنی پر رہا ہے (۱) فیس داخلہ اور چندہ رکنیت (۲) جماعتی ضروریات کے لئے مختلف فنڈ قائم کر کے قوم سے ان کے لئے چندے کی اپیلیں کرنا (۳) ان معاوضوں طریقوں میں اول الذکر براہ راست مغربی سیاست کی جماعت بندیوں سے اخذ کیا گیا ہے جس کی کوئی مثال کتاب و سنت میں نہیں ملتی۔ انبیاء نے جو اسلامی جماعتیں قائم کی ہیں ان کی فیس داخلہ لا الٰہ الا اللہ کے انقلابی عقیدہ پر خلوص کے ساتھ پابند ہونے کے سوا کچھ نہ تھی اور ان کا چندہ رکنیت اسلامی عبادات و اخلاق کے اتباع کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جہاں تک انبیاء کی جماعتوں کی مالی ضروریات کا تعلق ہے، وہ صرف مومنین کے جذبۂ انفاق سے پوری ہوتی تھیں۔ وہاں ہر ایک شخص اسلام کو قبول کر کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی منظم تحریک میں شامل ہوتا تھا تو اپنی جیب کو ساتھ لے کے آتا تھا۔ اسے زکوٰۃ و صدقات اور منت نذر کے علاوہ ہنگامی ضرورت پر اپنا مال بغیر کسی شحِ نفس کے جماعت کے بیت المال میں داخل کرنا ہوتا تھا۔ انبیاء کے اس اسوہ کو ہماری سیاسی پارٹیوں نے ترک کر دیا، کیونکہ درحقیقت ان کے پورے ڈھانچے ہی اسلامی بنیادوں سے ہٹ کر مغربی بنیادوں پر استوار ہوئے تھے۔ خاص طور پر ان جماعتوں کی حیثیت ہی مذہب و سیاست کی تفریق کے نظریہ پر مبنی ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے نہ تو اس کی توقع ہی تھی کہ زکوٰۃ و صدقات کے وصول و صرف کو شرعی احکام و حدود کے مطابق منظم کریں اور نہ ان کو دینی بنیادوں پر جذبۂ انفاق کے ابھارنے کے لئے کوئی وجہ جواز نظر آتی تھی۔ اس وجہ سے ہماری جماعتوں کو مجبوراً فیس اور چندہ کا مغربی طریق اختیار کرنا پڑا۔

بخلاف ان کے چونکہ جماعت اسلامی دین و سیاست کو ایک کر کے نمودار ہوئی تھی اس لئے اس نے اپنے طریق کار کے ہر گوشہ کو اسوۂ انبیاء کے چراغوں سے روشن کرنے کا قطعی اصرار لے کر لیا تھا۔ اس وجہ سے اس نے فیس اور چندہ رکنیت کے طریقے سے بالکل ہٹ کر اسلامی جذبۂ انفاق پر اپنے مالیات کا دار و مدار رکھا اور خدا تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس پیغمبرانہ طریق کار کو اختیار کرنے میں خود خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے وہ برکتیں ظہور میں آئیں کہ جماعت کا کوئی کام محض مالی وجوہ سے کبھی رکا نہ رہا اور نہ ان شاء اللہ آئندہ رکے گا۔ اس نے تحریک کا دامن صرف افرادی سے نہیں باندھا بلکہ اسلام کی خدمت کرنے والی جماعتیں ہر دور میں اس کی مخاطب ہیں۔

فیس داخلہ اور چندہ رکنیت تو درحقیقت جذبۂ انفاق کو کمزور کرنے کے ذرائع ہیں۔ اس طریق کی بنا پر رقوم جب کسی جماعت میں "ضابطہ" کے تحت وصول کی جاتی ہیں تو اس کے ارکان ان رقوم کو ادا کر کے خواہ مخواہ مطمئن ہو جاتے ہیں

کہ ہم نے اپنی مالی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ بخلاف اس کے تحریک اسلامی کی اگر کوئی مالی ضرورت آ گئی ہوئی ہو تو ایک شخص اگر فراخی رکھتے ہوئے صرف ایک معینہ رقم ادا کر کے بیٹھ رہے تو خدا اس کی گرفت ہو گی کہ تمہارے پاس "العفو" - The Savings - موجود تھا، لیکن پھر بھی تم اسلامی بیت المال کو فاقہ کشی کرتے دیکھتے رہے۔ اور تمہاری جیب کا منہ کھل کر

جہاں تک پبلک میں عام چندے جمع کرنے کا تعلق ہے، اس کی مثالیں انبیا کی جماعتوں میں بھی پیش آئی ہیں اور وہ یقیناً ایک جائز طریقہ ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عام چندوں کا جو سلسلہ اختیار کیا گیا تھا، وہ بھی انبیا کی جماعتوں کے طریقے سے نہیں، بلکہ مغربی جماعتوں کے بگڑے ہوئے نمونے سے اخذ کیا گیا ہے۔ انبیا اور صالحین نے جن اصولوں کی پابندی کی ہے وہ یہ تھے

(۱) چندے کا مطالبہ ہمیشہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کی مجلسوں میں پیش کیا گیا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اقامت دین کی مہم سے اختلاف کرنے والوں اور اسلامی عقائد و اخلاق سے انحراف کرنے والوں سے بھی چندے کی اپیل کی گئی ہو جو لوگ اپنے دین و مذہب کو نظام اسلام پر ترجیح دیتے ہوں ان کے چندوں کی اللہ کے دین کو کوئی حاجت نہیں ہے۔

(۲) چندہ وصول کرنے کے لیے بھی لوگوں کو خوشامد اور شہرت طلبی کی چاٹ نہیں لگائی گئی بلکہ انہیں یہ تو سمجھایا گیا کہ انفاق کو اللہ کی خاطر کر رہے والے مخلصین ہیں۔

(۳) اس چندہ دینے والے کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ اسلامی تحریک کے اصولوں اور مقاصد اسلامی کی پالیسی پر اپنی چندے کی رقوم کے بل پر اثر انداز ہو یا چندہ دے کر کسی طرح کے جاہ و منصب کا سودا کرے۔

(۴) مالی مدد ہمیشہ صالح ہاتھوں سے لی گئی اور اس غرض سے پوری کی گئی کہ حلال طیب کمائی ہی سے دی جاتی تھی۔ اور پھر صالح جذبات کے ساتھ دی جاتی رہی ہے۔

لیکن بیان اصولوں کی صریح خلاف ورزی کی جاتی رہی ہے اور آج بھی کی جاتی ہے! اس بات کا سرے ہی سے کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا کہ جن لوگوں کے سامنے چندے کی اپیل کی جا رہی ہے، وہ اصول و مقصد سے متفق ہیں یا نہیں اور انکو ایک جماعت یا ادارے پر اعتماد بھی یا نہیں۔ چنانچہ وقتی جذبات کی اکساہٹ کے ذریعہ بسا اوقات مقصد کے مخالفین تک سے چندہ لیا جاتا ہے۔ پھر کتنے ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی کیجالت میں کسی خوش فہمی کی بنا پر چندہ دے بیٹھتے ہیں لیکن بعد میں کڑھتے اور پچھتاتے ہیں۔ سیاسی چندہ باز بالکل مداریوں کی طرح مخاطبین کی نظربندی کر کے روپیہ جمع کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

پھر یہ واقعہ ہے کہ مسلم سوسائٹی کا شیرازہ بکھر جانے اور مسلمانوں کے اسلام سے دور جا پڑنے کی وجہ سے عبادات اور جذبات صالحہ مر گئے ہیں وہاں جذبہ انفاق فی سبیل اللہ بھی ٹھٹھر گیا ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں نے اس جذبہ کی آبیاری کی کوشش ترک کر کے انہیں کی بجائے انفاق

فی سبیل اللہ کے بجائے "الانفاق فی سبیل نفس" سے کام لینے کا پروگرام اختیار کر لیا، اور لوگوں کے سفلی جذبات کو تقاضا فراہم کر کے چندے جمع کرنے شروع کر دیئے۔ آپ کو اگر چندے کے کسی جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا ہو یا کسی چندہ وفد میں آپ شریک ہوتے ہوں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کتنے ہی گھٹیا انسانوں سے چندے وصول کرنے کے لئے ان کی خوشامدیں کی جاتی ہیں، ان کے سامنے صریح جھوٹی قصیدہ خوانی ہوتی ہے، پھر حسب موقع دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ چندہ نہ دو گے تو تم کو فلاں ذریعے سے نقصان پہنچایا جائیگا، یہ بھی کہا جاتا کہ خدا کے لئے نہ دو، اہم معززین کی خاطر چندہ دے دو، پھر بسا اوقات چندہ دینے والوں کے ناموں کا اور ان کی دی ہوئی رقموں کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر ان کی خواہش شہرت کی پرورش کی جاتی ہے، عطیوں کے ناموں کے کتبے نصب کئے جاتے ہیں، اور چندے کی اپیل کے ساتھ باقاعدہ لالچ دلایا جاتا ہے کہ تمہاری ناموری کے لئے یہ یہ کچھ کیا جائیگا۔ یہ سارے طور طریق اسلام کے اصولوں کی قطعی نفی ہیں اور یہ نہ صرف خود معصیت ہیں، بلکہ معصیت کے فروغ کے بہترین ذرائع ہیں۔

یہ بیماری بھی چندے کی دنیا میں عام ہے کہ چندہ دینے والے سرمایہ داروں کے سامنے چونکہ خدا و آخرت کا سوال نہیں ہوتا اس لئے وہ چندے کو کسی جماعت کے نظام میں دخیل ہونے اور اس کی زمام کار پر قبضہ کرنے کیلئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اپنی چندے کی رقوم سے اپنی رائے کا وزن بڑھا کر ایک تحریک کی پالیسی پر اثر ڈالتے ہیں۔ چونکہ چندہ وصول کرنیوالوں کو ان حالات کا علم ہوتا ہے، اس لئے بسا اوقات وہ خود اس طرح کے سودے کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ سیاسی [illegible] جو کچھ زیادہ ماہر فن ہوتے ہیں، وہ بالکل پس پردہ بیٹھ کر سیاسی تحریکوں میں اس طرح روپیہ لگاتے ہیں جیسے کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔ اور اس سے مختلف فوائد حاصل کرتے رہتے ہیں۔

پھر چندوں کی وصولی میں یہ لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے کہ دینے والا کس شعور، کس مقصد، کس جذبہ اور کس طریقے سے مل رہا ہے اور کیسا مال ہے جس میں سے اجتماعی ضروریات کے لئے کوئی حصہ نکالا ہے اور مال دینے والے کی سیرت، اس کا کردار اور لوگوں سے اس کا اخلاقی معاملہ کیسا ہے اور خدا کے دین سے اس کا عام تعلق کس درجے کا ہے۔ یہاں یہ نقطہ نظر کبھی سامنے ہوتا ہی نہیں کہ چندہ دینے والا کہیں اپنے حرام کی کمائی اور حرام کاروبار کیلئے چندے کو ایک پناہ گاہ اور ایک آڑ کے طور پر تو نہیں استعمال کرنا چاہتا کہ دنیا جہان کے معاشی مفاسد سے کمائی کرے، خدا کے بندوں کی حق تلفیاں کرتا رہے اور پھر خدا یا قوم کے نام پر چندہ

ے مسلم لیگ کے ایک عہدیدار نے میرے سامنے ایک دن فخریہ بیان کیا تھا کہ فلاں شخص نے چونکہ مجھے دس روپے چندہ نہیں دیا تھا اس لئے میں نے محکمانہ بے رحمی کے کام کرنے کے ذریعہ اس کی گھوڑا گاڑی کا چالان کرا دیا۔

ٹے صرف کر کے "صاحبِ تقویٰ" اور "خادمِ ملت" بھی بنا پھرے۔ اس قسم کے عطیات سے دنیوی تحریکیں پاک ہوں تو کچھ عجب نہیں لیکن دینی تحریکیں اپنے بیت المال کو ان غلط فنڈوں سے بچانے پر مجبور ہیں چنانچہ نبی صلعم کو بعض منافقین کے صدقات قبول کرنے سے خدا تعالیٰ نے صریحاً روک دیا تھا۔

چندوں کی اس داستان کا دوسرا تاریک پہلو یہ ہے کہ ہماری قوم کا اخلاقی تنزل اپنی حد تک پہنچ چکا ہے اور ہمارے سیاسی ورکروں اور خدام ملت نے قومی چندوں اور اجتماعی فنڈز میں بددیانتیاں کرنے کی ایسی افسوسناک تاریخ بنا دی ہے کہ آج کسی صالح تحریک کے کارکنوں کے لئے چندہ لینے کے لئے نکلنا بجز اس کے ممکن نہیں رہا کہ وہ پیشگی خیانت کا الزام اپنے سر لیے پھریں اور اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا بڑی جھوٹی جا بجا پیٹتے پھریں۔

ان اشارات کو ملحوظ رکھ کر سوچئے کہ جماعت اسلامی کے لئے صحیح طریق کار کیا ہو سکتا تھا اور چندہ جمع کرنے کے بارے میں جو روایات بن چکی ہیں ان کے ہوتے ہوئے اسے کس روش پر چلنا چاہئے تھا چنانچہ جماعت اسلامی کے اجتماع اول میں امیر جماعت نے جماعت کے لئے مالی پالیسی ان الفاظ میں طے کر دی تھی کہ:-

"ذی استطاعت ارکان کا فرض ہے کہ زیادہ سے زیادہ جس قدر مالی ایثار کر سکتے ہوں کریں اور جماعت کو مالی حیثیت سے مضبوط بنائیں۔ رہے جماعت سے باہر کے لوگ تو ان سے ہرگز کوئی مدد طلب نہ کی جائے۔ البتہ اگر وہ خوشی اور بلا شرط کوئی مدد دینا چاہیں تو قبول کر لی جائے لیکن کوئی بڑی سے بڑی مالی اعانت بھی اس صورت میں قبول نہ کی جائے جب کہ اندیشہ یہ ہو کہ اس کے معاوضہ میں جماعت کی پالیسی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔"

یہ بجائے خود حقیقت ہے کہ جماعت کے باہر کے صاحبین کی ایک تعداد پہلے بھی رضاکارانہ طور پر مالی اعانت کرتی رہی ہے اور اب بھی کرتی ہے، لیکن جماعت نے اپنی اصولی پالیسی میں کوئی لچک بہرحال اس حد تک پیدا ہونے نہ دی اور نہ آئندہ وہ ایسا ہونے دے گی۔ تاہم جماعت کا اصل کام جن ذرائع پر چلتا ہے وہ اس کے کارکنوں کی مالی اعانتیں ہیں جو تقریباً باقاعدگی کے ساتھ ملتی ہیں اور یا پھر اس کے مکتبے کی آمدنی ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی وقف کردہ کتب اور بعض دوسری کتابوں کو شائع کرتا ہے اور اس کی آمدنی بیت المال میں داخل ہو جاتی ہے۔

برائے احتیاط جماعت کے سالانہ اجتماعات میں ہر سال گذشتہ کے حسابات آمد و خرچ پیش کر دیے جاتے ہیں اور اس بات کا موقع ہر مسلمان کو حاصل رہتا ہے کہ جب چاہے دفتر میں آ کر حسابات کی پوری تفصیل دیکھ لے۔

جماعت کو اپنی اس صحیح دینی پالیسی پر قائم رہنے کے لئے بارہا مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے، اور آج بھی اس کی آمدنی اس کے کام کی وسعتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے لیکن بد گمانی کی کارسازیاں ... ہر حال میں گرہ کشا رہی ہیں یہ ہے اصل صورت واقعہ جس کے پیش نظر جب غیر اسلامی طریق پر چندہ لینے والے اور چندہ دینے والے جماعت اسلامی کے کام کو بڑھتا دیکھتے ہیں تو ان کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ جماعت اپنی مالی ضروریات کیسے پوری کر لیتی ہے؟ ان حضرات کی رائے میں جماعتوں کے مالیات کا نظام لازماً غیر اسلامی ہی ہونا چاہئے، اور اگر کوئی جماعت اسلام کے جائز طریقوں پر کاربند ہو تو اسے لازماً کسی غیر ملکی طاقت کی طرف سے روپیہ آتا ہے۔ خصوصیت سے ہماری سوسائٹی کے اسلام فراموش سرمایہ دار اس بات پر بہت سٹپٹاتے ہیں کہ جماعت اسلامی ان کے آگے ہاتھ پھیلائے بغیر اور ان کی خوشامد کئے بغیر کیوں کام چلا رہی ہے۔ اور کیوں ان کو جماعت پر اثر انداز ہونے کا راستہ نہیں مل پا رہا؟ ان کے نزدیک خدا کے خزانے رزق جماعت اسلامی کی کفالت کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں، بس ہو ہی سکتا ہے کہ ان کی مالی امداد سے جو جماعت بے نیاز ہے وہ کسی غیر قوم کے سرمایہ داروں کی منت کش تو ضرور ہوگی، یہ لوگ زبان سے چاہے دعویٰ نہ کریں، تحت الشعور میں اپنی "ہمانشما خداوندی و رزاقی" کا زعم ضرور چھپائے ہوتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جنہوں نے ہمیشہ اخلاق و دیانت سے بے نیاز ہو کر سیاسی زندگی گذاری ہے، چنانچہ وہ اپنے ضمیر کے آئینے میں جماعت اسلامی کے کارکنوں کو دیکھتے ہیں، اور یہ تصور باندھتے ہیں کہ جب ہم ہی مالیات میں خیانت کاریوں سے بچ نہیں سکے تو کوئی اور کیوں کر بچ سکتا ہوگا! لازماً جماعت اسلامی کے پیچھے بھی خائنانہ نظام مالیات کارفرما ہے۔

اس قسم کی بدگمانیوں کو جب لوگ جماعت اسلامی کے خلاف ایک حربے کے طور پر استعمال ہونے کے قابل پاتے ہیں تو پھر وہ اپنی خیال آرائیوں کو افترا بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ یہ حربہ بالعموم اس صورت میں استعمال کیا جاتا ہے جب کہ دلائل کے ترکش خالی ہو جاتے ہیں اور حریف کے اصول و مقصد کو کسی معقول استدلال سے شکست دینا ممکن نہیں رہتا۔ یہ معاملہ ہر اس فرد، جماعت اور تحریک کو پیش آتا ہے جس کے اصول و نظام اور جس کے عملی مظاہر پر کوئی مخصوص اعتراض کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس آخری مگر ناپاک حربے کے میدان میں آنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مخالفین کے پاس دلائل کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے، اور اب ان کی مقبولیت شکست کھا چکی ہے۔ اس کی ایک واضح ترین مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالفین نے پیش کی ہے۔ ان کے دلائل کے سارے ہتھیار جب کند ہو چکے اور عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام کی پاکیزگی اور آپ کے خیالات

کی رفعت آپ کے اخلاق کی بلندی ہر شبہے سے بالاتر ہو چکی تو آخری اعتراض یہ اٹھایا گیا کہ آپ کا کام بھلا سہی لیکن یہ خود آپ کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک دستِ شر کام کر رہا ہے یعنی آپ لوگوں میں سے بدروحوں کا غلبہ (یعنی شیطانی اثرات) شیطان کے ایک کارندے ——— بعلزبول ——— کی مدد سے دور کرتے ہیں۔ اس کا جواب عیسیٰ علیہ السلام سے بہتر طریق پر کون دے سکے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر شیطان خود ہی اپنے غلبے کو ختم کرنے اور اپنے آپ کو مٹانے پر اتر آیا ہے تو پھر اسے کون بچا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب نبی صلعم کے مخالفین کی منطق عاجز ہو گئی تو انہوں نے الزام یہ تراشا کہ اس شخص کی ساری خوش بیانیاں درحقیقت نوازیاں کسی بھوت پریت کے کرشمے ہیں۔

آج جماعت اسلامی کو بھی ٹھیک اسی قسم کی صورتِ حالات درپیش ہے۔ اس کے عوامی ہر حلقے میں داخل ہونے کے بعد اقتدار پرستوں کے حلقے سے اٹھنے والے تمام اعتراضات کو جب پوری طرح شکست ہو گئی تو مخالفتِ حق کے اسلحہ خانہ سے آخری ہتھیار بھی میدان میں لے آیا گیا ہے ——— یہ کہ جماعت اسلامی انڈین یونین کے روپے پر کام کر رہی ہے!

پیشتر اس کے کہ اس کے جواب میں ہم کچھ کہنے کے مکلف ہوں، شریعتِ اسلامی اور عقلِ سلیم دونوں کی رو سے اس اعتراض کے مصنفین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے الزام کو زبانوں پر لانے سے پہلے اس کے ثبوت کی فراہمی کا سامان کریں ایک جماعتِ حق کے خلاف یہ الزام بالکل وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ کے لئے واقعۂ افک کی تھی۔ یہ مشغلہ ہمیشہ مسلمانوں کے نام دھرا کر اسلام کے خلاف تگ و دو کرنے والوں کو بہت پسند رہا ہے چنانچہ حضرت عائشہ کی عصمت مآبی کو شک و شبہ سے بالا قرار دیتے ہوئے قرآن نے مسلمانوں کو ہدایت دی تھی کہ "اذا جاءکم فاسق بنبأٍ" جب کوئی فاسق کسی طرح کی خبر لے کے تمہارے سامنے آئے تو اس سے تفصیل طلب کرو اور واقعہ کے دلائل اور ثبوت کا مطالبہ کرو، ورنہ اس طرح کی فتنہ پھیلانے کی کوششیں اسلام اور امت کے لئے مہلک ثابت ہو سکتی ہیں۔

قرآن کا یہ حکم نگاہوں سے چونکہ اوجھل ہے، اسلئے فساق و فجار کو کیا چھٹی مل گئی ہے کہ وہ اپنی مجالسِ نجویٰ میں جو چیزیں بھی گھڑیں، ان کو گلی گلی کہتے پھریں، اور سوسائٹی ایسی ہے کہ اس قسم کی من گھڑت بدبیانیوں کو ایک ایک سامع کئی کئی سو آدمیوں تک پہنچا کے دم لیتا ہے۔ آج الزامات کے مصنفین سے کوئی پوچھنے والا نہیں رہا کہ اپنے بیان کے لئے شہادت لاؤ۔ اور جو دلائل تمہارے پاس ہیں، انہیں پیش کرو۔ ان کو یہ خدشہ نہیں ہے کہ اگر انہوں نے ایک غلط بیانی

کی اور پھر اس پر ثبوت نہ دے سکے تو ان پر "حدِ قذف جاری ہوگی" بلکہ آج ہر فاسق اثیم کو آزادی ہے کہ ذلیل سے ذلیل الزام کسی شریف آدمی اور کسی صالح جماعت کے سر چیپک دے" الٹا اس بگڑے ہوئے ماحول میں ایک شریف فرد اور ایک صالح جماعت پر یہ ذمہ داری ڈالی جاتی ہے کہ وہ ثابت کرے کہ جو بہتان اس کے خلاف تراشا جا رہا ہے، وہ اس سے بری الذمہ ہے۔

اگر جماعت اسلامی موجودہ عدالتی نظام کی آلودگیوں سے حتی الوسع بچنے کی روش اختیار نہ کر چکی ہوتی تو اس قسم کی الزام تراشیاں کرنے والوں کو عدالت کے کٹہرے میں طلب کر کے ان سے دلائل و شواہد مانگتی، لیکن وہ اس بات پر ضرور حیرت کرتی ہے کہ جن لوگوں کو جماعت اسلامی پر انڈین یونین سے روپیہ لینے کے کوئی دلائل حاصل ہیں، وہ کیوں نہیں اپنی حکومت کو ان سے مطلع کرتے اور کیوں نہیں اس کی سی آئی ڈی کو اس پر آمادہ کرتے کہ وہ حالات کی تحقیق کرے اور کیوں نہیں وہ عدالتوں کو مجبور کرتے کہ وہ غیر ملکی روپیہ پر کام کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دے۔ گلی گلی کانا پھوسیاں کرتے پھرنا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ دنیا میں حق کی مخالفت کرنے والے پہلے بھی ہو گزرے ہیں، مگر ایسی بزدلی کسی میں نہ تھی۔ وہ بھی تو مردانِ کار تھے جنہوں نے یوسف علیہ السلام جیسے ناکردہ گناہ کو جیل بھجوا کے چھوڑا اور وہ خیر بہادر بھی تو تھے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر قیصر کی غداری کا مقدمہ چلایا اور پیلاطوس کو سزا کا فیصلہ دینے پر مجبور کر دیا۔ آخر یہ ہمارے ہی غازیانِ اسلام کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایک الزام گھڑ چکے ہیں، اس کے ساتھ افسانے بنا چکے ہیں (بلکہ ایک صاحب تو یہاں تک کہتے پائے گئے ہیں کہ میں نے خود جماعت اسلامی کے امیر کے دستخطوں کی رسید اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔) تو آخر کیوں وہ کھلی عدالت میں اپنی معلومات کے دلائل نہیں لے آتے۔ یہ مجرموں کی طرح سر چھپائے پھرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ پاکستان کے ان اکابر بہی خواہوں کے اندر اگر کچھ بھی خلوص ہے تو ہم ان کو چیلنج کرتے ہیں کہ پاکستان کے مفاد کی خاطر جس کا دن رات آپ دم بھرتے ہیں، اپنے دلائل و شواہد کو میدان میں لے آئیے، ورنہ قرآن کے قانون کی نگاہ میں آپ قذف، فسق اور نفاق جیسے ذلیل جرائم کے مجرم ہوں گے ۔۔۔۔۔۔ اور ملک کے صالحین آپ کو بہر حال نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے!

لطیفے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کا اولین الزام ۱۹۴۳ء میں جمعیت العلماء کے کیمپ کی طرف سے سامنے آیا اور ایک بزرگ نے بر سر عام یہ خبر شائع کی تھی کہ جماعت اسلامی کو شملے سے انگریزی حکومت نے ۵۰ ہزار روپیہ کانگریس کی مخالفت کرنے کے لئے دیا ہے۔ دوسرا الزام مسلم لیگ کے قوم پرست حلقوں کی طرف سے پاکستان بننے کے بعد عاید کیا گیا کہ جماعت انڈیا کی کانگریس حکومت کی مالی مدد پر کام کر رہی ہے۔ تیسرا الزام ایک اخبار نے نشر کیا کہ اس جماعت کو ماسکو کی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے روبل آتے ہیں اور ایک دوسرے اخبار نے اس کے ساتھ ہی یہ الہام شائع کیا کہ امریکہ

سے ڈالر آرہے ہیں۔ ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پہلے یہ سارے مدعی ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک مشترکہ فتویٰ صادر فرمادیں پھر جماعت اسلامی سے جواب طلب کیا جائے۔

تاہم چونکہ ایک مومن فرد اور ایک صالح جماعت کے لئے راہ صواب یہی ہے کہ وہ دوسرے مومنین و صالحین کو اپنے متعلق سوئے ظن میں خواہ مخواہ مبتلا نہ ہونے دے اور مبتلا ہو جائیں تو ان کو اس سے بچانے کی کوشش کرے، اس وجہ سے حسب ذیل تصریحات عرض کی جاتی ہیں:-

(۱) سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسا ذریعہ ہے جس کے تحت غیبی طریق سے کوئی خارجی مدد جماعت اسلامی کو بہم پہنچتی ہے؟ اگر انسان اس کا ذریعہ ہیں تو حکومت اپنے سرحدی انتظامات کے تحت کسی پراسرار آمد و رفت کو کیوں نہیں پکڑتی؟ کیا وجہ ہے کہ روپیہ درآمد ہو رہا ہو اور پاکستان کے کسٹم آفس کو پتہ نہ چلے؟ ایک حساب کتاب چل رہا ہو اور کوئی رسید پرچہ پکڑا نہ جائے؟ ـــــ

(۲) جماعت اسلامی کو اگر روپیہ اور جاہ ہی مطلوب تھا اور وہ بھی کانگریس سے ـــــ تو اس مقصد کے لئے وہ وقت مناسب ترین تھا جبکہ قوم کے بڑے بڑے علما اور پاکستان کے موجودہ اکابر میں سے بعض کے لئے کانگریس کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر متحدہ قومیت کی تبلیغ کرنا قابل فخر تھا۔ اس وقت تو جماعت اسلامی کانگریس کی آلۂ کار نہ بنی، لیکن اب جبکہ پوری مسلمان قوم کانگریس کے اصول و نظام سے شدید طور پر متنفر ہو چکی ہے اور اب جبکہ تقسیم ہند کا واقعہ رونما ہو چکا ہے، اب اس کو انڈین یونین کی امداد حاصل کرنے کا موقع ملا ہے! ـــــ کیا یہ بات قرین قیاس ہے؟

(۳) آج مسلم لیگ کے کارکنوں کو زبان درازیاں کرتے ہوئے یہ خیال نہیں آتا کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک کے دور میں جب مسلم لیگ کو کانگریس کے متحدہ قومیت کے طوفان کو روکنے کیلئے کوئی دلائل نہیں مل رہے تھے، اس وقت اسی شخص نے ان کو کانگریسی فلسفہ و تحریک کے خلاف ٹھوس دلائل فراہم کئے، جس نے اسلامی تحریک کا آغاز کیا اور جس کی رہنمائی میں جماعت اسلامی ۱۹۴۱ء سے کام کرتی چلی آرہی ہے۔ اس کی لکھی ہوئی دو کتابیں "مسئلہ قومیت" اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" ہزاروں تعلیم یافتہ مسلمانوں نے پڑھی ہیں (بلکہ خود مسلم لیگ کے اکابر نے ان کو پھیلایا ہے) اور ان میں سے اکثر آج بھی زندہ و سلامت موجود ہیں۔ خود یہ دونوں کتابیں بھی برابر شائع ہو رہی ہیں، ان کو پڑھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کانگریسی تحریک سے مسلمانوں کو بچانے میں زیادہ سے زیادہ حصہ انہیں دو کتابوں کا ہے، انکے وجود میں آنے سے پہلے مسلم لیگ کے

پاس اپنے نظریئے اور اپنی سیاسی فکر کی حمایت میں کوئی ٹھوس لٹریچر موجود نہ تھا، بلکہ بعد میں بھی اس پائے کی کوئی کتاب تحریکِ پاکستان کے حق میں نہیں لکھی جا سکی۔ اب ذرا غور کیجئے کہ کیا انڈین یونین کی کانگریسی حکومت کم نہیں کتابوں کے مصنف اور اس کی تحریک پر روپیہ صرف کرنا چاہتی؟ اور پھر کیا آپ کو بھی کانگریس سے نسبت رکھنے کا الزام دینے کیلئے یہی شخص اور اسی کی تحریک ملی، کوئی اور نہ مل سکا؟

(۴) اگر کانگریسی حکومت روپے کے زور سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتی تھی تو کیوں نہ اپنے روپے کے زور سے اس نے خضر وزارت کو اور خان برادران کی تحریکِ پٹھانستان کو زوال سے بچا لیا؟ —— اس کو اب جماعتِ اسلامی ہی کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے کی ضمانت کہاں سے مل گئی ہے؟

(۵) پھر سوال یہ بھی ہے کہ اگر جماعتِ اسلامی دوسروں کی آلۂ کار بن کر ہی کام کرنے والی تھی، تو اسے کس نے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے سے روکا تھا جبکہ مسلم لیگ کو گذشتہ الیکشن میں کارکنوں کی ضرورت تھی۔ اس جماعت کی فطرت اگر موقع طلبی کی ہوتی تو وہ اس وقت مسلم لیگ کے اسٹیج پر آ کر اس کے ذریعے پوری رائے عامہ پر قبضہ کر سکتی تھی۔ جس جماعت نے اس وقت دنیا بنانے کی فکر نہ کی، وہ آخر اب تقسیمِ ہند کے بعد ایک غیر ملکی طاقت کے روپے کے بل پر کیسے اپنے افراد کو پالنے پوسنے کے سامان کرنے کی ذلیل صورت اختیار کر سکتی ہے؟

(۶) یہ بھی سوچئے کہ دنیا پرستوں کے نقطۂ نظر سے تو دنیا بنانے کا بہترین موقع پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوا تھا جبکہ بڑے بڑے متقدسین نے لوٹ مار میں حصہ لیا اور پاکستان کے خاص الخاص وفاداروں نے اور قوم کے اعلیٰ درجے کے لیڈروں نے ناجائز الاٹمنٹیں کیں اور کرائیں۔ جماعتِ اسلامی کا معبود اگر روپیہ ہوتا تو وہ کیوں نہ مالِ غنیمت کے دریا سے اپنے بیت المال کی آبیاری کرتی۔ لیکن اس جماعت پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ پاکستان بھر میں واحد جماعت یہی ہے جو آج یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس کے کسی کارکن کا دامن اس طوفانِ معصیت سے آلودہ نہیں ہوا۔ عین اس جماعت پر بددیانتی کا ایک جعلی الزام لگانے کے لئے وہ لوگ کس منہ سے سامنے آتے ہیں جن کے گھر مالِ حرام سے پٹے پڑے ہیں اور جو تقسیم کی برکات سے نودولتیے بنے پھرتے ہیں، اور جن کے اکابر عدالتوں کے سامنے نہایت گندے الزامات کی جوابدہی کر رہے ہیں۔ شاید یہ لوگ اپنے جرائم کی پردہ پوشی کیلئے اپنے گناہوں کا بوجھ جماعتِ اسلامی پر لادنا چاہتے ہیں لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

(۷) جماعت اسلامی پر زبان کھولنے والے حضرات جماعت اسلامی کے عام معیارِ اخلاق کو دیکھیں اور پھر خود سوچیں کہ کیا اس معیارِ اخلاق کی جماعت تمام کی تمام ایسی ہو سکتی ہے کہ اس کے کارکنوں کو نامعلوم ذرائع سے روپیہ ملتا ہے، اس کے حسابات جعلی ہوں، اور اس کے بعض افراد غیر ملکی طاقتوں سے ساز باز کرتے ہیں اور جماعت میں کوئی احتجاجی ردِ عمل پیدا نہ ہو؟

جماعت اسلامی وہ واحد جماعت ہے جس نے اپنے ایک ایک فرد کو سود، رشوت، قتال فی غیر سبیل اللہ، ملازمتِ نظامِ ظلم، بلیک مارکیٹ، مالِ غنیمت کی لوٹ، ناجائز الاٹمنٹوں اور اکل اموال بالباطل کی دوسری تمام صورتوں سے بچانے کی کوشش کی ہے اور اس قسم کی آلودگیوں کے ساتھ وہ کسی کو رکن بنانے اور رکھنے پر تیار نہیں ہے، کیا اس ساری اخلاقی تربیت سے اس کے کارکنوں میں اتنا احساس تقویٰ بھی پیدا نہیں ہوا کہ پاکستان سے باہر کے ایک غیر الٰہی نظامِ حکومت کی مالی امداد پر کام کرنے والوں کے پیچھے چلتے رہیں اور کسی طرح کا اضطراب نہ دکھائیں؟ ـــ اور کیا اگر اس کے اکابر ایسے ہی کھوٹے لوگ ہیں تو ان کی دعوت میں اثر اور ان کی سیرتوں میں پائیداری ہو سکتی ہے؟ ـــ یقیناً نہیں!

(۸) کیا جماعت اسلامی کے لئے روپیہ کمانے کی یہ شاہراہ کھلی ہوئی نہیں ہے کہ وہ موجودہ اربابِ اقتدار کے تمام غیر اسلامی کارروائیوں کی حمایت کرنے پر اتر آئے، وہ موجودہ نظام کے غیر اسلامی نظام پر اسلام کا لیبل لگانے پر تیار ہو جائے، وہ سرکار کی ضروریات پوری کرنے کیلئے فتووں اور تعویذوں کی دکان کھول لے، اور اس کے کارکن اپنے علم اور دماغ کو اپنی فاسد قیادت کو کرائے پر دے کر آمدنیاں پیدا کریں، اور جاہ و منصب میں ان کے حصہ دار بن جائیں؟ جب گھر بیٹھے سہولت سے حرام کمائی مل سکتی ہو ـــ اس حال میں کہ پاکستان کی وفاداری کے خطاب بھی حاصل رہیں ـــ تو آخر جماعت کے لوگ بے وقوف تو نہیں ہیں کہ انڈین یونین سے ہی جا کے ساز باز کرنے کو ضروری سمجھیں۔

(۹) یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ جماعت اسلامی جس نظام کی داعی ہے، اس کے متعلق خود بعض وفادارانِ پاکستان ہی یہ کہا کرتے ہیں کہ اس جماعت کے پیش کردہ نظام کو لے کر چلنے سے انڈین یونین کی حکومت بگڑ جائیگی، لیکن دوسری طرف یہی لوگ یہ الزام نہ معلوم کس طرح گھڑ کے لے آتے ہیں کہ جماعت اسلامی جس نظام کو لانا چاہتی ہے اس کے غالب کرنے میں انڈین یونین ہی کا روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ تضاد بیانی مدعیوں کا مقام جو کچھ ہو سکتا ہے وہ واضح ہے!

(۱۰) جماعت کے جتنے جلسے اور دورے ہوتے ہیں، اور جتنے پوسٹر اور پمفلٹ اس کی طرف سے شائع ہوتے ہیں

جس طرح ان کے عملی انتظامات جماعت کے کارکن خود کرتے ہیں ——— اور اللہ کی عبادت کے جذبے سے کرتے ہیں ——— اسی طرح وہ ان کے مصارف کو اپنے اوپر بانٹ لیتے ہیں ہمارے محترم الزام تراشوں کو سوچنا چاہئے کہ اگر پاکستان بھر میں پوسٹر لگانے کے لئے اسٹنسل دیواروں پر لکھنے کے لئے پمفلٹ اور لیف لٹ ہر شہر میں تقسیم کرنے کے لئے اور جماعت کے جلسوں میں شریک ہونے اور ان کے انتظامات کرنے کے لئے انڈین یونین سے آدمی نہیں آتے، بلکہ وہ پاکستانی شہری ہی ہوتے ہیں جو ان سارے کاموں کو سر انجام دیتے ہیں تو یہی شہری دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ مالی ذمہ داریوں کا بار بھی اٹھاتے ہیں۔

آخر جماعت اسلامی حلقے میں ارکان، ہمدردان، متفقین اور متاثرین کی جو مجموعی تعداد شامل ہے، وہ اگر ایک ایک کوڑی بھی ہر ہفتے جمع کرتے ہوں (ہماری تنظیم میں ہفتہ وار اجتماعات ہی ساری سرگرمیوں کا محور ہیں)، تو کچھ رقم تو بہرحال جمع ہوتی ہی ہوگی۔ کیا محض اتنی سی بات پر یہ الزام لگا دینا درست ہوگا کہ انڈین یونین سے روپیہ آتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں اگر مسلم لیگ کے ارکان کی طرح ہمارے مردان کار دو آنے سالانہ دینے والے ہوں اور اپنی باقی کمائیاں اطمینان سے مسرفانہ زندگی گذارنے میں کھپاتے رہیں، تب تو جماعت اسلامی کو انڈین یونین کے روپے سے بےنیاز سمجھا جائیگا، لیکن اگر اس کے کارکن کچھ زیادہ انفاق کرتے والے ہوں اور اپنا پیٹ کاٹ کر خدا کی راہ میں مال صرف کریں تو پھر اس مال کی نسبت انڈین یونین سے ہوگی۔ یہ سزا ہے اس جرم کی کہ ہمارے کارکنوں میں اپنی عیاشی کے بجائے خدا کی راہ میں مال صرف کرنے کا جذبہ ہے کیوں!

(۲) جماعت کے ہمہ وقتی کارکن، جو کفالتی معاوضوں پر کام کرتے ہیں، ان کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ دراصل جماعت کی سرگرمیوں کا انحصار پورے کارکنوں کی مشترکہ مساعی پر ہے جو اپنے تن بدن اور اپنے اہل وعیال کی خدمت سے وقت نکال کر دین کی راہ میں جدوجہد کرنے کو اپنے لئے واجب مانتے ہیں اور کسب معاش سے جو کچھ بچا سکیں اس کو لہو ولعب اور گھٹیا تفریحات میں صرف کرنے کے بجائے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بدیں وجہ جن لوگوں کو خدا کی راہ میں کام کرنے کیلئے وقت نکالنے کی لذت حاصل نہیں ہے، جب میدان عمل میں بے شمار کارکن کام کرتے نظر آتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ سب تنخواہ دار ملازم ہوں گے جن پر صرف ہونے والے روپے کا سیلاب انڈین یونین سے پاکستانی سرحدوں میں چلا آ رہا ہوگا۔ حالانکہ انہوں نے یہ معلوم کرنے کی تکلیف فرمائی ہی نہیں کہ جماعت کا کام کیسے

چلتا ہے۔

(۱۲) یہ الزام کہ جماعت کے کارکن اُجلے کپڑے پہنتے ہیں یا اپنے رہن سہن میں ذوقِ سلیم کا ثبوت دیتے ہیں، الحمد للہ کہ اسے سن کر خوشی ہوتی۔ اسلام وہ مذہب نہیں جس نے رہبانیت کا درس دیا ہو اور جو اپنے کارکنوں کو میلے کپڑوں اور اُلجھے بالوں کے ساتھ دیکھ کر خوش ہو۔ بلکہ اسلام وہ دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں نظم، جمال، سلیقہ، ادب، تمیز اور خوش ذوقی کے مظاہر دیکھنا چاہتا ہے چنانچہ نبی صلعم نے اپنے رفقا کو تیئیس سال تک جن فضائلِ تہذیب و اخلاق کی مسلسل تربیت دی ہے، ان میں صفائی، ستھرائی، سلیقے اور خوش ذوقی کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ جماعت اسلامی کوئی صوفیوں کا ٹولہ نہیں ہے جو رالکھ جٹاؤں میں ڈالے اور انگ بھبوت رمائے پھرتے ہوں اور جن کے بدنوں سے پسینے کی بُو کے بھبکے چھوٹ رہے ہوں۔ اس جماعت نے دین کی خدمت کے لئے دنیا کے بیکار کئے ہوئے لوگوں کو نہیں جمع کیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ وہ ذہین، تعلیم یافتہ، روشن دماغ اور صالح لوگ ہیں جو طاغوت کے نظام کے چلانے کے لیئے بہترین پرزے بن سکتے تھے، اور بنے ہوئے تھے، لیکن انہوں نے اپنے آپ کو باطل کی خدمت سے الگ کر کے دین کے لئے وقف کیا ہے۔ ایسے لوگوں سے سخت مفلسی میں بھی ذوق کی پستی کی توقع نہ کیجئے کہ "اللہ والے لوگ" پھٹے حالوں رہ کر دنیا پرستوں کے کبر کی فضا فراہم کریں۔ اور انہیں جو دیکھے وہ یہ فقرہ چست کر دے کہ:۔

"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"

یہ لوگ آپ کی طرح اپنے اپنے ذرائع معاش رکھتے ہیں اور اپنے حصے کا رزق علیٰ قدر مراتب اللہ تعالیٰ کے خزانے سے حلال ذرائع کی پابندی کے ساتھ پاتے ہیں، اور جو کچھ پاتے ہیں اسے خرچ کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہ دنیا کا انتظام نئے اصولوں پر چلانے کیلئے اٹھے ہیں، نہ کہ جامد دینداری کا ڈرامہ کھیلنے کے لئے! لوگوں کو یہ غلط فہمی بھی دور کر لینی چاہئے کہ ذوق اور سلیقہ اور طہارت و نظافت کا دار و مدار روپے کی کثرت اور اسراف کے مسلک پر ہے جی نہیں! دنیا میں بہت سے اہلِ تعفف ایسے ہوتے ہیں جو غریبی میں بھی اپنے سراپا سے اللہ کی بخششوں پر اس طرح اظہارِ تشکر کرتے ہیں کہ ان کے انتہائی مشکلات میں گھر جانے پر بھی ظاہر بیں لوگ یہ نہیں جان سکتے کہ وقت کے اصل مستحقِ استعانت یہی لوگ ہیں۔ یہ دل کی غنا کا نور جن پیشانیوں میں جھلکتا ہے ان کے سامنے اہلِ اسراف کو اپنے لباس اور اپنے اطوارِ معاشرت بہت ہی گھٹیا معلوم ہوتے ہیں یہ وہ دولت ہے جسے نہ انڈین یونین کے روپے سے خریدا جا سکتا ہے، نہ پاکستان کے روپے سے!

جماعت اسلامی کے ان خوش ذوق کارکنوں کی اولین صفوں میں وہ لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف کتابیں لکھتے، صحافت کی ڈیوٹی انجام دیتے اور تقاریر کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے گھر کا سودا سلف لاتے ہیں، اپنے گھروں کے سارے کام کاج کرتے ہیں اور عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔۔۔

پھر یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے صاف ستھرے لباسوں کے ساتھ ستمبر ۱۹۴۷ء میں لاہور کی سڑکوں اور گلیوں سے رنگا رنگ غلاظتیں اٹھائی ہیں، جنہوں نے والٹن کیمپ کے آس پاس سے انسانی فضلے کے انبار ہٹائے ہیں، جنہوں نے ہیضے کا شکار ہونے والے مہاجرین کی ان سینکڑوں لاشوں کو بایں ہمہ ذوق سلیم قبروں میں اتارا ہے، ان کی تجہیز و تکفین کے لئے۔۔۔۔ پانچ پانچ روپے کی مزدوری پر بھی حکومت کو کارکن نہیں مل رہے تھے ——— حالانکہ لاہور مسلم لیگ کے ممبروں سے اور پاکستان کے اصلی خادموں سے بھرا پڑا تھا۔ کیا اب ان لوگوں کے اجلے لباس اور ان کے شاداب چہرے اس بات کی دلیل بنا دیئے گئے ہیں کہ انڈین یونین سے روپیہ آتا ہے؟۔

غالباً مذکورہ بالا تصریحات اہل اخلاص پر اصل حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو اپنی ساری پست اخلاقیوں کے ساتھ محض فتنہ آفرینی کی خدمت انجام دینی ہے، انکو ان تصریحات سے اطمینان نہ ہو تو ان سے گزارش یہی ہے کہ آپ اپنے مشاغل میں لگے رہیئے۔ ہم آپ کا منہ بند کرنے کے ذرائع نہیں رکھتے۔ آپ کا منہ خود آپ کا اخلاق ہی بند کر دیگا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ اپنی گھٹیا تدبیروں سے ایک خدا پرست جماعت کی ہوا اکھیڑنے میں آپ کامیاب ہو سکیں گے؟

ان باتوں کو ٹھنڈے دل سے سوچئے اور خدا سے ڈریئے! آخر کار اس کی عدالت میں آپ کو حساب دینا ہے!!!

مطبوعات

اسلامی معاشیات

نتیجۂ تحقیق: جناب سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ (دکن)

شائع کردہ: ادارۂ اشاعت اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد، دکن۔

پاکستان میں ملنے کا پتہ: مکتبہ رزاقی، نیپئر روڈ۔ کراچی

قیمت مجلد ۷ روپے ۱۲ آنے۔

یہ دور جس میں انسان کی معاشی حس بہت تیز ہوگئی ہے علمائے اسلام سے اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اسلام کے معاشی فلسفے اور نظام کے جدید پیرائے میں مرتب کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ وقت کے اس مطالبے کے جواب میں اب تک ایک جامع کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" (ندوۃ المصنفین) کے نام سے سامنے آئی ہے اور دوسری کتاب یہی اسلامی معاشیات ہے۔

بڑے سائز کے سوا چار سو صفحات میں مولانا گیلانی نے معلومات کے جو خزانے پیش کئے ہیں، ان کی وسعت کا اعتراف کون نہ کرے گا۔ بیچ بیچ اوامر و نواہی کے بے شمار ایسے گوشے اس کتاب میں بے نقاب کئے گئے ہیں جن تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں ہے۔ کتاب اپنے مصنف کے مرتبۂ علمی کے پیش نظر اس کی محتاج نہیں ہے کہ اس کے محاسن کی کوئی قصیدہ گوئی کی جائے۔ پس راقم الحروف کے سامنے قابلِ ذکر اگر کوئی چیز ہے تو صرف یہ کہ مولینا نے اپنی کتاب کو دورِ حاضر کے ترقی یافتہ "فن ترتیب مباحث" سے ایک حد تک بے نیاز رکھا ہے۔ مولینا کی زبان، اندازِ بحث، اصطلاحات اور تقسیم فصول وغیرہ اس معیار سے آزاد ہیں جو آج کل کے معاشی علوم کی کتابوں میں رائج ہے۔ بلکہ مروجہ معیار کے تتبع کی جہاں جہاں کوشش کی گئی ہے، وہاں تصنع اور تکلف کا رنگ نمایاں ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک انجنیئر کے سامنے گوناگوں پرزوں کا ایک ڈھیر لگا ہے اور وہ ایک خاص نقشے پر کسی خاص قسم کی ایک کل مرتب کرنے کے بجائے یہ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ قسم کے پرزوں کا ایک خوشنما مجموعہ تیار کر دے ——— بلا لحاظ اس کے کہ وہ مجموعہ ایک منتظم کل ہو یا نہ ہو اور اس کو چالو کیا جا سکے یا نہ کیا جا سکے!

تاہم مولینا کا یہ علمی کارنامہ کوئی رائگاں جانے والی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ خزانۂ معلومات انشاءاللہ نظام اسلامی کے موضوع پر غور و فکر کرنے والے دوسرے لوگوں کے کام آئے گا اور مولینا کی تحقیق ان کو جدید سائنٹفک طرز پر اسلامی علم معیشت کی تدوین کرنے میں غیر معمولی امداد بہم پہنچائیگی۔

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۴/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ	
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-	لائحہ عمل	(زیر طبع)
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ بگاڑ	فی -/۹/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ الف ذیلدار پارک اچھرہ ـ لاہور (پاکستان)